مجلہ پاکستان ایئر فورس کالج سرگودھا

شہباز

نگران : حکیم محبوب عالم خان
ایم اے (علیگ)
مدیر: فلائٹ کیڈٹ انڈر آفیسر
غلام مجدد
نائب مدیر: فلائٹ کیڈٹ ظہیر حسن شیرازی

شہباز

۱۹۷۶—۷۷

مجلہ پی۔ اے۔ ایف، کالج ○ سرگودھا

ترتیب

		صفحہ
اداریہ	مدیر	۱
اقبال کا تصور خودی و بے خودی	جناب عبدالعزیز کپال ، صدر شعبہ علوم انسانی	۳
تجدید عہد (نظم)	جناب محبوب عالم خان ، شعبہ اردو	۱۹
نظریات اقبال پر ایک نظر	فلائٹ کیڈٹ خالد محمود اختر	۲۰
علامہ اقبال (نظم)	فلائٹ کیڈٹ خالد محمود اختر	۲۵
دو عظیم ہم عصر	فلائٹ کیڈٹ انڈر آفیسر غلام مجدد	۲۶
معمار پاکستان کے آخری ایام	فلائٹ کیڈٹ سہیل شفیع چغتائی	۳۰
نذر قائد (نظم)	فلائٹ کیڈٹ انڈر آفیسر غلام مجدد	۳۶
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور	جناب خلیق احمد قریشی ، شعبہ اردو	۳۷
صدائے ماتم	پائیلٹ آفیسر تعظیم رسول انجم	۴۵
سید فصیح الدین کی یاد میں (نظم)	فلائیٹ کیڈٹ محبوب حیدر	۴۸
میرا باپ	فلائیٹ کیڈٹ انڈر آفیسر غلام مجدد	۴۹
فضائیہ کا ہر ایک افسر (نظم)	فلائیٹ کیڈٹ یاور عباس	۵۳
غزل	فلائیٹ کیڈٹ ظہیر شیرازی	۵۴
ارتقائے نو	فلائیٹ کیڈٹ سارجنٹ خالد اقبال باجوہ	۵۵
دو غزلیں	جناب حکیم محبوب عالم خان ، شعبہ اردو	۶۳
لافانی ادب	فلائٹ کیڈٹ شیخ فرجاد الرحمن	۶۵
غزل	فلائٹ کیڈٹ شبیر احمد	۶۹
غزل	فلائیٹ کیڈٹ بابر میر نشاط	۷۰

اداریہ

معزز قارئین !

۱۹۷۶ء کا سال ہماری قومی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس سال بابائے قوم کا صد سالہ جشن ولادت منایا گیا ۔ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں بابائے قوم کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ۔ خصوصاً مسلم ممالک نے اسلام کے اس بطل جلیل کو گہری عقیدت اور وابستگی سے خراج تحسین پیش کیا ۔ بابائے قوم کا کارنامہ بھی تو اس قدر غیر معمولی ہے کہ اسے معجزہ کہا جا سکتا ہے ۔ پاکستان کا قیام اسلام کی عظمت و رفعت کا ثبوت اور ہماری نشاۃ ثانیہ کی اہم ترین کڑی ہے ۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ ۱۹۷۷ء حکیم الامت کے صد سالہ جشن ولادت کا سال ہے ۔ حکیم الامت اور بابائے قوم میں فکر اور خون کا گہرا رشتہ ہے ۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمان امت کو ایک فکر جوان عطا کی اور بابائے قوم کی جواں ہمتی نے اسے عملی جامہ پہنایا ۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کا وہ عمل جس کے اعجاز سے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا ۔ اب ہماری ذمہ داری ہے ، وقت کی اس اہم ذمہ داری کو نبھانے کے لیے ہمارے پاس حکیم الامت کی فکر اور بابائے قوم کے عزم صمیم کا سرمایہ ہونا چاہیے ۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم زندگی کے گُر شاہین کی خصوصیات اور مرد مومن کے اوصاف ہی سے سیکھ سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ہم اپنے اساتذۂ کرام کے نہایت ممنون و مشکور ہیں جو ہمیں زندگی کے انداز سکھاتے ہیں اور ہمارے اندر اعلیٰ اوصاف کی نشو و نما کا اہتمام کرتے ہیں ۔ خدا نے چاہا تو ہم وقت کی ہر آزمائش میں پورا اتریں گے ۔

مدیر

قارئین کرام !

۲۱ فروری ۱۹۷۷ء کا دن ہمارے کالج کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا ۔ اس دن ہمارے بزرگ اور محترم استاد ، منیر اسکواڈرن کے آفیسر انچارج سید فصیح الدین دل کے دورے کے بعد خالق حقیقی کو جا ملے ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

ہمارے کالج بلکہ پاک فضائیہ کے لیے ان کی وفات ایک بہت بڑا نقصان ہے ۔ وہ ایک صاحب کردار انسان اور عظیم استاد تھے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ استاد کبھی مرتا نہیں بلکہ اپنے ہزاروں شاگردوں کے روپ میں زندہ رہتا ہے ۔

اقبالؒ کا تصور خودی

عبدالعزیز کمال

خودی کا تصور اقبال کے ہاں اس قدر ہمہ گیر اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ ان کی کوئی کتاب ، کوئی نظم بلکہ کوئی شعر ایسا نہیں جس میں اس کا پرتو اور اشارہ موجود نہیں ۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جس قدر یہ تصور عام ہے اس قدر اس کا فہم عام نہیں ۔ علامہ نے خودی کا فلسفیانہ تصور اول اول اپنی کتاب "اسرار خودی" میں پیش کیا تھا جو ۱۹۱۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی ۔ کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔ لوگ خودی کے لفظ کو غرور و تکبر کے ہم معنی سمجھ بیٹھے ۔ کچھ دوسرے لوگ خواجہ حافظ شیرازی کے اثرات کے بارے میں اقبال کے تنقیدی خیالات سے بہت جزبز ہوئے ۔ اخباروں میں لے دے ہوئی ۔ بعض لوگوں نے جوابی مثنویاں لکھیں اور علامہ کو عجیب و غریب القابات و خطابات سے نوازا ۔ حضرت اکبر الہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی جیسے دوست بھی بدک گئے ۔ مگر علامہ نے چونکہ بہت سوچ سمجھ کر اپنے فلسفۂ حیات کی پہلی اینٹ رکھی تھی ، وہ بلا تکلف پورے اعتماد کے ساتھ اس بنیاد پر ایک عظیم الشان محل تعمیر کرتے چلے گئے ۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء کے بعد انہوں نے جو کچھ بھی اردو ، فارسی یا انگریزی میں لکھا وہ مختلف زاویوں سے اسی تصور خودی کی تشریح و توضیح تھی ۔ اقبال انسان کی عظمت اور اس کے شرف و احترام کے بڑے قائل تھے ۔ ان کا پختہ ایمان تھا کہ اس کائنات میں اللہ کے بعد سب سے غالب ہستی انسان کی ہے ۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب علامہ یورپ کے سفر کے دوران مسجد قرطبہ اور قصر الحمراء دیکھنے گئے تو دیواروں پر ہر طرف "لا غالب الا اللہ" لکھا دیکھا ۔ واپس آئے تو کسی دوست نے پوچھا : کہیے قصر الحمراء اور مسجد قرطبہ کو کیسے پایا ۔ کہنے لگے : وہاں تو اللہ ہی اللہ غالب ہے ، انسان کہیں نظر آتا تو بات بھی تھی ۔ ایک محفل میں معجزات

کی حقیقت پر بات ہو رہی تھی ۔ ایک صاحب بولے : ڈاکٹر صاحب آپ فلسفی ہیں ، احد کے پہاڑ کے اس واقعے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جس کے مطابق ایک روز جب رسول اللہ ﷺ حضرت صدیقؓ ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ احد پر چڑھے تو پہاڑ کانپنے لگا تھا ۔ علامہ فوراً بولے : غضب کرتے ہو جس پہاڑ پر ایک نبی ﷺ ، ایک صدیقؓ اور دو شہید بیک وقت موجود ہوں کیا وہ کانپے گا نہیں ؟

خودی کا ایک پہلو زورِ عمل اور جوشِ عمل بھی ہے ۔ چنانچہ اقبال نے اپنی نظموں میں بعض جگہ چنگیز خان ، ہلاکو ، نپولین ، لینن اور مسولینی وغیرہ کی بھی تعریف کی ہے ۔ ایسی نظمیں پڑھ کر لوگ تذبذب میں پڑ جاتے ہیں اور اقبال کو تضاد کا طعنہ دیتے ہیں ۔ حالانکہ اقبال نے تو ابلیس کی تعریف بھی کی ہے اور ملّا سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کی ہے ۔ جہاں تک جوش کردار ، حرکت و عمل اور دُھن کا پکا ہونے کی بات ہے شیطان کا کردار قابل تعریف ہے ، مگر انجام کے لحاظ سے قابل تقلید نہیں ۔ شیطان جس جرأت و ہمت ، جس کوشش پیہم ، جن نت نئے اور پر فریب طریقوں سے تاریکی اور گناہ پھیلاتا ہے ، وہ گویا انسان کے لیے ایک چیلنج ہے کہ اسی ولولے ، ہمت اور لگن کے ساتھ وہ روشنی اور نیکی پھیلانے اور اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے کام کرے ۔ صرف ایک شعر یا ایک نظم پڑھ لینے سے اقبال ہاتھ نہیں آتا ۔ اقبال کا دقت نظر سے باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہیے ۔

آج کی مجلس میں تصور خودی پر بات کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کالج میں تعمیر کردار (کیریکٹر بلڈنگ) بطور ایک مضمون کے کورس میں شامل ہے ۔ دراصل تعمیر کردار اور تکمیل خودی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کے تصور خودی کو ذہن نشین کرنا اور اسے اپنی زندگی اور روز مرہ کردار میں بروئے کار لانا اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے ۔

اب میں نہایت اختصار سے عام فہم زبان میں «اسرار خودی» کے اہم اجزاء پیش کرتا ہوں ۔ «اسرار خودی» کا سرنامہ مولانا جلال الدین رومی کے تین اشعار ہیں جن کا ترجمہ کچھ یوں ہے : «کل ایک بزرگ ہاتھ میں چراغ لیے شہر کا چکر لگا رہے تھے ۔ کہتے تھے : میں درندوں اور حیوانوں سے بیزار ہوگیا ہوں ۔ سست اور کاہل ساتھیوں سے دل

گرفتہ ہوں ۔ مجھے انسانوں کی آرزو ہے ۔ مجھے شیر خدا علیؓ اور رستم جیسے بہادر اور جری انسانوں سے ملنے کی تمنا ہے ۔ میں نے کہا : ہم ڈھونڈ چکے ہیں ۔ ایسے انسان نہیں ملتے ۔ کہنے لگے : جس کو نایاب سمجھتے ہو اسی کی تلاش و جستجو ہے[1] ۔

«اسرار خودی» کی تمہید کے بعد علامہ واضح کرتے ہیں کہ تمام نظام عالم کی بنیاد احساس خودی پر ہے ۔ افراد کی زندگی کا تسلسل ، زندگی کا قائم و دائم رہنا استحکام خودی پر منحصر ہے ۔ خودی اپنے آپ سے ، اپنی ذات سے ، اپنے وجود سے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے آگاہ ہونے کا نام ہے ۔ خودی اس احساس کا نام ہے کہ میں دوسروں سے الگ اور جدا ہوں ۔ "میں "میں ہوں ، یکتا ہوں ، منفرد ہوں ، اپنی تقدیر کا آپ مالک ہوں ۔ چاہوں تو اپنی تقدیر سنواروں چاہوں تو بگاڑ کر رکھ لوں ۔ ظاہر ہے کہ جب فرد میں احساس «فردیت» اجا گر ہوگا تو دوسرے فرد سے اس کی کشمکش پیدا ہوگی ۔ کشمکش ہوگی تو فرد اپنی ہر قوت ، اپنی ہر خوبی ، اپنی ہر صلاحیت کو مجتمع کرکے بروئے کار لائے گا ، اسے صیقل کرے گا ، چمکائے گا اور زیادہ سے زیادہ کارآمد بنائے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات میں ہر طرف کشمکش و پیکار ، سعی و کوشش اور مسابقت کا عمل جاری ہے۔ دنیا کی ہر چیز محو خود نمائی ہے اور خاک کا ہر ذرہ شہید کبریائی ہے ۔ چنانچہ خودی ہی کے زور سے قطرۂ بے مایہ گوہر آبدار بنتا ہے ۔ خودی ہی کے فیض سے ریت کا ذرہ چمکتا ہے ۔ خودی ہی کی بدولت گھاس کی پتی زمین کا سینہ چھید کر نمودار ہوتی ہے ۔ خودی ہی کے عمل سے پھول کی کلی چٹکتی ہے اس کے بر عکس خودی میں ضعف ہو تو پہاڑ بھی بکھر کر صحراء ہو جاتا ہے ، شمع پگھل کر نابود ہو جاتی ہے ، انسان انسان نہیں رہتا ، حیوان بن جاتا ہے بلکہ حیوان سے بھی بد تر ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ احساس خودی کیونکر پروان چڑھایا جائے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ یوں ممکن ہے کہ تیرے سامنے ہر لحظہ کوئی نہ کوئی مقصد ہو ۔ اگر ایک مقصد حاصل ہو جائے تو دوسرا مقصد سامنے رکھ لے۔ تا کہ آرزو اور جستجو کا تسلسل قائم رہے ۔ مقصد زندگی جس قدر بلند اور عظیم ہوگا ، خودی کی تعمیر اور نشو و نما اسی قدر با معنی اور جاندار ہوگی ۔ جس دل میں آرزو اور مقصد کی شمع روشن نہ ہو اس کی حیثیت مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں ہوتی ۔

پھر زندگی کے لیے صرف کوئی مقصد سامنے رکھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ دل میں اس مقصد کے حصول کے لیے سچی تڑپ اور لگن کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ اقبالؒ نے جہاں جہاں عشق اور محبت کے الفاظ استعمال کیے ہیں ، وہاں عام شاعروں والا عشق نہیں بلکہ مقصد حیات کے لیے انتہائی کوشش و محنت اور سعی و جستجو مراد ہے ۔ پھر جس طرح تخلیق مقاصد اور عشق مقاصد سے خودی مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے ، اسی طرح سوال کرنے یا دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے غیر کے زیر بار احسان ہونے سے خودی مجروح و ضعیف ہوتی ہے ۔ جو لوگ خود محنت و مشقت کرنے کے بجائے دوسروں کے خوانِ نعمت پر نظر رکھتے ہیں ، یا ذرا ذرا سی بات کے لیے دوسروں کے محتاج بنتے یا مثلاً امتحان میں نقل کرتے ہیں ، ان کی خودی بڑھتی نہیں گھٹتی ہے ۔ علامہ کہتے ہیں اپنی مشت خاک کی حفاظت کر ، اسے سوال کرکے بکھیر نہیں ۔ چاند کی طرح اپنی روزی اپنے پہلو سے حاصل کر ۔ رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے دست و بازو سے روزی کمانے والے کو اللہ کا دوست کہا تھا ۔ اور تو ہے کہ معمولی معمولی سے کاموں کے لیے دوسروں کا دست نگر بنتا ہے ۔ خودی کی تکمیل و تربیت کے لیے رزقِ حلال بے حد ضروری ہے ۔ تیری اصل کمائی وہ ہے جسے تو نے اپنے دست و بازو سے پیدا کیا ہے ۔ باپ کی جائداد کا حریص ہونا گداگری کے سوا کچھ نہیں ۔ علامہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جو بادشاہ رعایا سے خراج لے کر لباس حریر پہنتا اور اپنے تاج میں موتی ٹانکتا ہے وہ سب سے بڑا گداگر ہے ۔

خودی جب تخلیق مقاصد اور عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو دنیا کی تمام ظاہر اور مخفی قوتیں اس کے زیر نگین ہو جاتی ہیں ۔ اس کی رضا اللہ کی رضا اور اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے ۔ علامہ نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے ۔ شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ نے اپنے ایک خادم کو کسی کام سے بازار بھیجا ۔ خادم اپنے خیالات میں گم چلا جاتا تھا کہ پیچھے سے حاکم شہر کی سواری آ نکلی ۔ چوب دار "ہٹو بچو" کی آواز لگاتا خادم کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر کہ درویش بے پروا چلا جاتا ہے اس کے سر پر چوب دے ماری ۔ درویش خادم فریاد کرتا شیخ بو علی کے پاس آیا اور شکایت کی ۔ شیخ سخت بر افروختہ ہوئے ۔ اپنے کاتب سے فرمایا: "قلم اٹھا اور اس فقیر کی طرف سے

سلطان دھلی کے نام فرمان لکھ۔ اسے لکھ کہ تیرے حاکم شہر نے فقیر کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ اگر خیریت مطلوب ہے تو اس گستاخ حاکم کو یہاں سے ہٹا دے ... ورنہ تیری مملکت تجھ سے چھین کر کسی دوسرے کے حوالے کر دوں گا۔ جب یہ فرمان بادشاہ کے پاس پہنچا تو مارے خوف کے اس پر لرزہ طاری ہوگیا۔ فوراً حکم صادر کیا کہ حاکم کو پا بجولاں دھلی لایا جائے۔ ادھر حضرت امیر خسرو کو سفیر بنا کر شیخ بو علی کی خدمت میں روانہ کیا اور تقصیر کی معافی چاہی۔

«اسرار خودی» میں آگے چل کر علامہ نے تربیت خودی کے تین مراحل بیان کیے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان کی پابندی کرنا، اطاعت سے اختیار پیدا ہوتا ہے اور قواعد و ضوابط کی پابندی ہی سے انسان اعلیٰ اور سچی حریت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ضبط نفس کا ہے، اطاعت اور ضبط نفس لازم و ملزوم ہیں۔ جو شخص اپنے وجود اور ذات پر مکمل اختیار نہیں رکھتا وہ جلد یا بدیر دوسروں کا محکوم بن جاتا ہے۔ اسلام کے ارکان خمسہ کی اصل غایت آدمی کو ضبط نفس کی تربیت دینا ہے اور اسے دنیا کی محبت اور دوسرے کے خوف سے آزاد کرنا ہے۔ اطاعت اور ضبط نفس سے کندن بن کر انسان دنیا میں اللہ کا نائب ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اللہ کے اذن سے جیسے چاہتا ہے چیزوں میں تصرف کرنے لگتا ہے۔ دنیائے وجود میں جتنے بھی معجزے رونما ہوئے ہیں انھی عظیم انسانوں کے ہاتھوں ہوئے جنھوں نے سعی و کوشش اور محنت و ریاضت سے اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا اہل بنا لیا تھا۔

خودی کے فیض و برکت سے جو محکمی اور پختگی پیدا ہوتی ہے اسے اقبالؒ نے حکایتوں میں واضح کیا ہے۔ آپ بھی ایک دو حکایتیں سنیں۔

مرو (ایران) کا رہنے والا ایک نوجوان سیّد علی ہجویری داتا گنج بخش لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کرنے لگا کہ دشمنوں میں محصور ہوں۔ بہت مشکل میں ہوں کیا کروں، شیخ کامل فرمانے لگے: «تو ایک خوابیدہ قوت ہے، بیدار ہو، اپنے آپ کو کمزور نہیں مضبوط سمجھ۔ پھر جب اپنے آپ کو شیشہ خیال کرنے لگتا ہے تو وہ فی الحقیقت شیشہ بن جاتا ہے اور ذرا ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹنے لگتا ہے۔ راہرو اپنے آپ

کو ناتواں و کمزور سمجھ لے تو ریزن کے شر سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا ۔ ارے نوجوان ، دشمن کا وجود تیرے حق میں رحمت ہے ۔ دشمن جس قدر قوی ہوگا تیرے حق میں اتنا ہی بہتر اور مفید ہوگا ۔ حیوانوں کی طرح کھا پی کر پیٹ بھر لینا اور آرام کی نیند سو رہنا زندگی تو نہیں ۔ زندگی اپنی قوتوں کو بیدار کرنے ، انہیں پروان چڑھانے اور ان سے کام لینے کا نام ہے ۔ موت یہ نہیں کہ روح بدن سے جدا ہو جائے بلکہ موت یہ ہے کہ آدمی اپنی خودی کی پرورش سے غافل ہو جائے ۔

پیاس کی شدت سے ایک پرندہ پانی کی تلاش میں سرگرداں تھا ۔ باغ کے کونے میں ایک ریزۂ الماس نظر پڑا ۔ لپک کر پہنچا اور قطرۂ شبنم سمجھ کر اس پر چونچ ماری ۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا الماس کا ٹکڑا بولا : "ارے نادان پرندے اپنی چونچ کی خیر منا ۔ میں شبنم کا قطرہ نہیں ، ہیرے کی کنی ہوں تجھ جیسے پرندوں کی چونچیں توڑ دینا میرے لیے مشکل نہیں" ۔

اس کے بعد علامہ پوچھتے ہیں کہ دشمن کے مقابلے میں شبنم کا قطرہ بننا پسند کرو گے یا ہیرے کی کنی ؟ خودی کی حفاظت کرو گے تو یقیناً ہیرے کی کنی بن جاؤ گے ۔ جو دشمن کے دانت توڑ دے گی ۔ خودی سے غافل رہو گے تو شبنم کا قطرہ بنو گے جسے ایک حقیر سا پرندہ بھی بآسانی حلق سے نیچے اتار لے گا ۔

کان کے اندر ایک کوئلے کا ٹکڑا الماس سے کہنے لگا : "اے ہمدم ، اے ساتھی ، ہم دونوں کی اصل ایک ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں تو کسمپرسی کا شکار ہوں اور تو بادشاہوں کے تاج میں جگہ پاتا ہے ۔ میں آگ میں جھلس جاتا ہوں اور میری متاع دیوٹیں کے بگولے میں ایک چنگاری کے سوا کچھ نہیں ۔ ادھر تو ہے کہ تجھ میں ستاروں جیسی چمک ہے اور تیرے ہر پہلو سے نئی کرن پھوٹتی ہے" ۔ الماس بولا : "اے حق ناشناس ساتھی میری روشنی اور تابناکی ، مضبوطی اور پختگی کی رہین منت ہے ۔ تو نرم اور کمزور ہے ۔ اس لیے بے مایہ ہے ، حجر اسود کو دیکھ کہ خاک کی ایک مٹھی کے سوا کچھ نہیں ۔ مگر پختگی اور صلابت نے اسے وہ شان اور رتبہ بخشا ہے کہ حرم کے ایک کونے میں ہزاروں سال سے اسی طرح پیوستہ ہے اور کالے گورے سبھی اسے بوسہ دینا باعث عزت سمجھتے ہیں" ۔

فرد کی طرح قوم و ملت کی مضبوطی ، استحکام اور استقلال کے بھی کچھ اصول ہیں۔ جس طرح فرد کی خودی اطاعت و ضبط نفس سے پختہ ہوتی ہے ۔ ملت کا استحکام ملی روایات پر مضبوطی سے قائم رہنے میں مضمر ہے ۔ ایک حکایت سنیے :

کوہ ہمالیہ سے ایک دن دریائے گنگا کہنے لگا : "تو روز اول سے ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا ہے ۔ تیری اس بلندی اور وقار و تمکین کا کیا فائدہ ؟ زندگی تو حرکت کا نام ہے" ۔ پہاڑ نے جب یہ طعنہ سنا تو بر افروختہ ہوکر بولا : "ارے نادان تجھ جیسے سینکڑوں دریا میرے سینے میں موجزن ہیں ۔ تجھے تو میں نے اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ تیرے اندر اپنا عکس حسین دیکھ سکوں ۔ تیری حرکت ہی تو تجھے بحر فنا میں جا ڈبوتی ہے جہاں تیرا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے ۔ مجھے دیکھ ، لاکھوں برس سے کس شان و تمکنت سے اپنے مقام پر کھڑا ہوں ۔ ستارے مجھے سجدہ کرتے ہیں اور لعل و گوہر سے میرا دامن بھرا پڑا ہے ۔ تیری طرح اگر میں بھی خرام ناز کرنے لگتا تو کبھی کا ریزہ ریزہ ہوکر فنا ہو چکا ہوتا" ۔

اسی سلسلے میں ایک اور حکایت سنیے : شمس تبریز جو کہ ایک مشہور صوفی ہو گزرے ہیں ، ایک روز مولانا جلال الدین رومی کے مکتب میں جا نکلے ۔ دیکھا کہ رومی فلسفۂ یونان کے درس و تدریس میں مشغول ہیں ۔ پوچھا : "یہ قیل و قال ، یہ بحث و تکرار کیا ہے؟" ملا کہنے لگے : "ارے دیوانے یہ علمی باتیں ہیں ۔ تجھے ان سے کیا غرض ؟ یہ باتیں تیری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں" ۔ شمس تبریزی نے یہ سنا تو ان کے سوز دروں نے شعلہ کی شکل اختیار کر لی اور ان کی برق نگاہ نے فلسفی کے تمام کتب خانے کو جلا کر راکھ کر دیا ۔ مولوی عشق کی معجز نمائیوں سے بے خبر تھا ، پوچھنے لگا : "یہ آگ تو نے کیسے روشن کی؟" شمس بولے : "یہ ذوق و حال کی باتیں ہیں تجھے ان سے کیا غرض؟ حال کی باتیں تیری سمجھ میں آنے کی نہیں ... تو غیروں کے علم پر نازاں ہے ۔ غیروں کا علم تیرے دل کو یخ بستہ تو کر سکتا ہے تجھے سوز دروں عطا نہیں کر سکتا ۔ مسلمانوں کا علم سوز دل ہی سے مکمل ہوتا ہے ۔ اسلام کے معنی یہی ہیں کہ زوال پذیر چیز کو ترک کر دیا جائے اور محکم و پائندہ حقائق سے لو لگائی جائے" ۔

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا «اسرار خودی» کے یہی تصورات ہیں جو اقبال کے فلسفے کی روح ہیں ۔ بعد میں وہ انہی خیالات کو مختلف انداز سے پیش کرتے رہے ۔ آخر میں «بال جبریل» کی ایک نظم کے کچھ اشعار جو «اسرار خودی» کے بیس برس بعد شائع ہوئی پیش کرتا ہوں ۔ آپ ان اشعار میں انہی تصورات کی صدائے باز گشت سنیں گے ۔

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

تصور بے خودی

عبدالعزیز کہال

علامہ اقبالؒ کے حوالے سے خودی کا لفظ جس قدر عام ہوا ہے بے خودی کا نہیں ہوا ۔ حالانکہ اہمیت کے اعتبار سے خودی اور بے خودی لازم و ملزوم ہیں ۔ تصور خودی اقبال کے فلسفۂ حیات کا بنیادی پتھر ہے اور اس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ فرد کو کیا ہونا چاہیے ۔ اس کے بر خلاف بے خودی سے مراد یہ ہے کہ فرد کو قوم سے کیا نسبت ہے اور قوم کے ساتھ اس کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں ۔

جس طرح «شکوہ» کے بعد «جواب شکوہ» کی ضرورت پڑی اسی طرح ۱۹۱۵ء میں «اسرار خودی» کی اشاعت کے بعد «رموز بیخودی» لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ ایک صد سے کچھ اوپر صفحے کی کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی ۔ اسرار خودی میں فرد کی تعلیم و تربیت اور اس کی پختگی و استحکام کا فلسفہ بیان ہوا تھا ۔ «رموز بے خودی» میں جماعت بندی اور بالخصوص ملت اسلامیہ کی خصوصیات اور اس کی تعمیر و ترقی کے اصول و قوانین بیان ہوئے ۔ دوسرے لفظوں میں خودی کا تعلق ایک ایک اینٹ کی ساخت ، پختگی ، ترکیب اور توازن سے ہے اور بے خودی کا بہت ساری اینٹوں کا باہم ترتیب پا کر ایک مضبوط اور مستحکم عمارت کی تعمیر سے ظاہر ہے کہ ایک مضبوط اور پائدار عمارت کے لیے پختہ اور پائیدار اینٹیں ہی درکار ہوتی ہیں ۔ کمزور ، کچی اور بے ڈھنگی اینٹوں سے جو عمارت بنے گی اس کی حقیقت معلوم .

فرد کے استحکام کے بارے میں علامہ نے جو اصول بیان کیے ہیں ، گو ان میں اطاعت اور ضبط نفس کی پابندیاں موجود ہیں ۔ مگر بجا طور پر یہ خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ فرد اگر انہی اصولوں کے مطابق اپنی شخصیت کو پرورش کرتا چلا جائے تو بعید نہیں کہ ہلاکو ، چنگیز خان ، ہٹلر اور مسولینی کی طرح انانیت کا پیکر بن جائے جس کی سرشت

میں سختی ہی سختی ہو ۔ نرمی نام کو نہ ہو ۔ جو اس قدر خود پرست اور خود نگر ہو کہ جھکنا جانتا ہی نہ ہو ۔

«رموز بے خودی» کا پہلا ایڈیشن نکلا تو دیباچہ میں علامہ نے لکھا : «افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے ۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے ۔ گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لیے بمنزلہ قوت حافظہ کے ہے .... اس نکتے کو مد نظر رکھ کر میں نے ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امت مسلمہ کا صحیح ادراک اسی نقطہ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے» ۔

مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ایک فرد کی شخصیت و کردار میں اس کا حافظہ اہم کردار ادا کرتا ہے اسی طرح کا کردار ایک قوم کی تعمیر و ترقی میں اس کی تاریخ ادا کرتی ہے ۔ مثلاً آپ غور کریں اگر ایک شخص اپنا یا اپنے باپ دادا کا نام ہی بھول جائے تو زندگی کے کاروبار میں اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ۔ اس طرح جو قوم اپنی تاریخ اور روایات سے غافل ہو جائے ، اقوام عالم کے ساتھ روابط میں اس کی کیا حیثیت رہ جائے گی ۔

لہذا اس سلسلے کا بنیادی اصول جو علامہ نے بیان کیا ہے ، یہ ہے کہ ملت کا ہر فرد ملی تاریخ ، ملی روایات اور اکابر کی سیرت و کردار سے وابستگی پیدا کرے ۔ چنانچہ آغاز کتاب میں علامہ نے ملت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے : «اے ملت ، تیرے پاس آئین و قانون اور روایات کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے ۔ جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ، پھر کیا وجہ ہے کہ تو دوسروں سے زندگی کے اصولوں کی بھیک مانگنے میں سرگرداں ہے ۔ دوسروں کے اصول حیات اپنانے سے تو تیری تقدیر بگڑے گی سنورے گی نہیں ۔ اے ملت ، تیرے دکھوں اور بیماریوں کا علاج یہ ہے کہ مصطفی ﷺ سے اپنا پیمان تازہ کرے اور ملت سے اپنا رابطہ استوار رکھے ۔ کیا تجھے خیر البشر ﷺ کا یہ قول یاد نہیں کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے ۔ فرد اور قوم تو ایک دوسرے کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ہیں ۔ فرد کا استحکام ملت سے وابستگی میں ہے اور ملت کا نظام افراد کی بدولت استوار ہوتا ہے ۔ فرد

جماعت میں گم ہو کر اپنے اندر سمندر کی سی وسعت پیدا کر لیتا ہے اور الگ رہ کر ناکارہ محض بن جاتا ہے ۔ بالکل اس لفظ کی طرح جو شعر سے الگ ہو کر اپنے معنی کھو دیتا ہے۔

اس تمہید کے بعد علامہ نے ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی کا ذکر کیا ہے ۔ رکن اول توحید ہے ۔ توحید کے معنی صرف ایک اللہ میں یقین رکھنا ہی نہیں بلکہ مساوات انسانی میں ایمان رکھنا بھی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حسب و نسب اور وطنی قومیت پر نازاں ہونا توحید کے منافی اور نادانی کی بات ہے ۔ ان چیزوں کا واسطہ بدن سے ہے اور بدن فانی ہے ۔ اسلامی قومیت کی بنیاد تصور توحید پر ہے اور یہ خدائے واحد کا کرم ہے کہ مختلف خطوں نسلوں اور رنگوں کے افراد توحید کا سبق پڑھ کر بھائی بھائی بن جاتے ہیں اور باہم یک دل ، یک زبان اور یک جان ہو جاتے ہیں ۔

مایوسی اور خوف تمام انسانی برائیوں کی جڑ ہیں ، انسان خوف کھائے تو صرف اللہ سے ۔ انسان کا انسان سے خوف کھانا دل میں آرزو ، کوشش اور امید کی پرورش کے لیے مہلک ہے ۔ آرزو اور امید نہ ہو تو عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور عمل نہ ہو تو زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔ اس کی وضاحت علامہ نے شہنشاہ عالمگیر اور شیر کی حکایت سے کی ہے ۔ ایک روز شہنشاہ عالمگیر جنگل کے کنارے نماز میں مصروف تھے کہ جنگل سے ایک شیر دھاڑتا ہوا نکل آیا اور آتے ہی بادشاہ کی کمر پر پنجہ دے مارا ۔ بادشاہ نے خنجر نکالا اور شیر کو وہیں ڈھیر کرکے دوبارہ نماز میں مشغول ہوگیا ۔ کیونکہ دل میں شیر کے خوف سے زیادہ اللہ کا خوف طاری تھا ۔ شہنشاہ عالمگیر کی شان میں ایک شعر سن لیجیے :

درمیان کارزار کفر و دین — ترکش ما را خدنگ آخرین

یعنی کفر و دین کے معرکے میں ہمارے ترکش کا آخری تیر ۔

ملت اسلامیہ کا دوسرا اساسی رکن رسالت ہے ، اللہ تعالیٰ نے انسانی اجسام پیدا کیے ۔ رسالت کے فیض سے مختلف رنگوں ، نسلوں اور خطوں کے لوگ باہم مل کر ایک ملت اور قوم بن گئے ۔ پہلے وہ حروف بے معنی و بے صوت تھے ۔ رسالت کے معجزے سے

مصرع موزوں اور شعر دلآویز بن گئے ۔ علامہ کہتے ہیں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جماعت کی شیرازہ بندی میں خدا کی نسبت نبی ﷺ کی ذات زیادہ محبوب نظر آتی ہے ۔ فرد بے شک اللہ کی ذات کے سہارے زندہ رہتا ہے ، لیکن ملت کی زندگی سر تا سر نبی ﷺ کی ذات سے وابستہ ہے ۔ اللہ نے اپنے احسان و کرم سے ہمارے نبی ﷺ کو خاتم الرسل ﷺ بنایا اور ہمیں خاتم الاقوام ۔ پھر ہمارے ہاتھوں میں اپنی خصوصی نعمتوں کا آخری جام دے دیا کہ رہتی دنیا تک ساقی گری کی خدمت بجا لاتے رہیں ۔

علامہ فرماتے ہیں رسالت محمدی ﷺ کا اصل مقصد بنی نوع آدم کو آزادی ، مساوات اور اخوت کا سبق دینا ہے ۔ اس کی تشریح میں تین حکایتیں بیان کی ہیں ۔ پہلی حکایت اخوت کے بارے میں ہے ، ایرانیوں کے خلاف ایک جنگ میں ایک مسلمان سپاہی نے بھولپن میں ایرانی سپہ سالار جابان کو پناہ دے دی ۔ بعد میں جب پتا چلا کہ پناہ لینے والا ایرانی افواج کا سپہ سالار ہے تو لوگوں نے اسلامی جرنیل ابو عبید سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا ۔ ابو عبید بولے : دیکھو ہم میں سے ہر ایک امین ملت ہے ۔ ایک مسلمان سپاہی کا عہد پوری امت کے عہد کے برابر ہے ۔ اگرچہ جابان ہمارا دشمن ہے ۔ لیکن ایک مسلمان بھائی جب اسے امان دے چکا ہے تو اس کا خون ہم سب پر حرام ٹھیرا ۔

مساوات اسلامیہ کی حکایت سلطان مراد اور اس کے معمار سے متعلق ہے ۔ معمار نے جب بادشاہ کے حکم اور ھدایات کے مطابق مسجد تعمیر نہ کی تو بادشاہ نے غضب ناک ہوکر اس کا ہاتھ کٹوا دیا ۔ معمار شکایت لے کر قاضی شہر کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا ۔ قاضی کو سخت طیش آیا ۔ اس نے بادشاہ کو عدالت میں طلب کر لیا ۔ بادشاہ سلامت عدالت میں پہنچے تو رنگ اڑا ہوا تھا اور نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ۔ چنانچہ فوراً ہی اعتراف جرم کر لیا ۔ قاضی نے فیصلہ سنایا کہ جرم کی پاداش میں بادشاہ کا ہاتھ کاٹا جائے گا ، کیونکہ اسلامی آئین میں مزدور اور حکمران میں کوئی فرق نہیں ہوتا ، نہ حکمران کا خون مزدور کے خون سے زیادہ رنگین ہوتا ہے ۔ بادشاہ نے فیصلہ سنا تو سزا کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا ۔ معمار نے قاضی کا فیصلہ سنا اور بادشاہ کی خجالت و ندامت دیکھی تو کہنے لگا : ہمارے رسول ﷺ نے ہمیں احسان کرنے کی تعلیم

دی ہے ۔ بادشاہ سلامت ، میں نے آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کی خاطر معاف کیا ۔ اقبال کہتے ہیں : دیکھا آئین پیغمبر کا رعب اور دبدبہ جس کی بدولت چیونٹی نے سلیمان پر فتح حاصل کی ۔

حریت اسلامیہ کی تشریح کے لیے علامہ نے حادثہ کربلا کا انتخاب کیا ہے ۔ آزادی اور جمہوریت کی یہ جنگ جو نواسۂ رسول ﷺ نے یزید کی ملوکیت کے خلاف لڑی ، اسلامی تاریخ کا ایک نہایت درخشاں باب ہے ۔ اس موضوع پر شعرا نے بڑی طویل نظمیں بلکہ پوری پوری کتابیں لکھی ہیں ۔ لیکن علامہ نے تین ساڑھے تین صفحے کی اس نظم میں فن شعر کی جن بلندیوں کو چھوا ہے وہ بلا شبہ انھی کا حصہ تھا ۔ اتنے خوبصورت اشعار مثنوی "رموز بے خودی" میں شاید ہی کہیں اور ملیں گے ۔ ان اشعار میں جذبے اور خلوص کی شدت اور فراوانی ہے ۔ چنانچہ صوتی اعتبار سے کیا اور معنوی اعتبار سے کیا ، اس نظم کی خوبیوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے ۔ شروع میں عقل و عشق کا موازنہ و مکالمہ ہے ۔ عقل حیلہ جو ہے سو بہیس بنا لیتی ہے ۔ عشق حریت پیشہ ہے اسے صرف آزادی کی فضا ہی راس آتی ہے ۔ نظم کا اصل حصہ وہ ہے جو

آں امام عاشقاں پور بتولؓ سرو آزادے ز بستان رسول ﷺ

سے شروع ہوتا ہے ۔ جو لوگ فارسی جانتے ہیں اسے خود پڑھیں اور فن شعر کی لطافتوں اور اسلامی تصور آزادی کی حقیقت سے بہرہ اندوز ہوں ۔

اسلامی اخوت ، مساوات اور حریت کی تشریح کے بعد علامہ نے جو دوسرے بڑے بڑے اصول بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں :

۱۔ ملت اسلامیہ کی اساس عالمگیر تصورات توحید و رسالت پر قائم ہے ۔ اس لیے یہ ملت کسی ایک وطن ، علاقے یا زمانے میں محدود و مقید نہیں ہو سکتی اور نہ وطن اس کی بنیاد بن سکتا ہے ۔ اس نظم میں علامہ نے اٹلی کے سیاسی مفکر میکیاولی پر سخت تنقید کی ہے جس کو انھوں نے شیطان کی طرف سے بھیجا ہوا

نبی قرار دیا ہے ۔ اس شخص نے مملکت و ریاست کو معبود کا درجہ دے کر اکثر انسانوں کو سخت گمراہی میں ڈال دیا ۔

۲۔ ملت اسلامیہ کا آئین و قانون کتابِ زندہ قرآن حکیم ہے ۔ جس کی تعلیم و حکمت لا زوال ہے ، اس میں نوع انسانی کے لیے اللہ کا آخری پیغام ہے اور اسے لانے والے پیغمبر رحمت للعالمین تھے ، جنھوں نے ریزنوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے دنیا کا رہبر و راہنما بنا دیا ۔ مسلمان قوم اگر بحیثیت قوم دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے تو صرف قرآن کی عملی پیروی کرنے سے ۔

۳۔ زمانۂ انحطاط میں قومی زندگی کو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اجتہاد کے بجائے تقلید کا طریقہ اختیار کیا جائے ، کیونکہ کم نظر اور خود غرض علماء کے اجتہاد سے تقلید رفتگاں محفوظ تر راستہ ہے ۔ آج کے زمانے میں نہ ذوق جعفر صادق رضی اللہ عنہ باقی رہ گیا ہے نہ کاوش رازی ۔ بلکہ حال یہ ہے کہ ہر بخیل اور حریص انسان اپنے آپ کو دین کا راز دان اور عالم سمجھنے لگا ہے ۔

۴۔ قومی کیریکٹر کی پختگی آئین الہی کی پیروی میں مضمر ہے اور قومی حسن سیرت کے لیے آداب و اخلاق محمدی ﷺ کو اپنانا ضروری ہے ۔ اس سلسلے میں علامہ نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ منظوم کیا ہے ۔ کہتے ہیں ہمارے دروازے پر ایک گداگر بھیک مانگتے آ نکلا اور رہ رہ کر صدا دینے لگا ۔ مجھے جو غصہ آیا میں نے اس کے سر پر ایک ڈنڈا دے مارا جس سے اس کی در در سے مانگی ہوئی بھیک زمین پر بکھر گئی ۔ میرے والد کو اطلاع ہوئی تو وہ میری اس حرکت سے سخت آزردہ ہوئے ۔ ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ۔ فرمانے لگے : «قیامت کے روز جب نبیوں کے سردار کی امت ان کے گردا گرد جمع ہوگی جس میں غازی بھی ہوں گے شہید بھی ، عالم اور زاہد بھی ، عاشق اور گنہگار بھی تو اس مجمع میں یہ گداگر اپنی صدائے دردمند بلند کرے گا اور میری جواب طلبی ہوگی تو میں کیا جواب دوں گا ؟ حضور فرمائیں گے :

حق جوانے مسلمے با تو سپرد | کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو این یک کار آسان ہم نشد | یعنی آن انبار گِل آدم نشد

یعنی تجھے اللہ نے ایک جوان بیٹا عطا کیا جو میری تعلیم سے بالکل کورا رہا ۔ تجھ سے یہ معمولی سا کام بھی نہ بن آسکا کہ مٹی کے ایک ڈھیر کو انسان بنا سکے .... بیٹا نبی ﷺ کی امت کے اس عظیم الشان اجتماع کا تصور کر ۔ میری ریش سفید کو دیکھ اور اس وقت مجھ پر جو امید و بیم کا لرزہ طاری ہوگا اس کا خیال کر ۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا باپ آقا کے سامنے ذلیل و خوار ہو ۔ مسلمان کی فطرت تو سراپا رحمت و شفقت ہوتی ہے ۔ تو نے گداگر پر نہیں اپنے باپ پر ظلم کیا ہے[1] ۔

۵۔ حیات ملیہ کے لیے ایک مرکز محسوس کی ضرورت ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کا مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے ۔ جب تک یہ ملت اس مرکز سے وابستہ اور اس کے طواف میں سرگرم رہے گی ، زندہ و پائندہ رہے گی ۔ مگر جونہی مرکز سے اس کا رشتہ منقطع ہوگا اس امت کا انجام بھی وہی ہوگا جو امت موسیٰ کا ہوا ۔

۶۔ ملت اسلامیہ کا حقیقی استحکام اور جمعیت اپنے نصب العین سے وابستگی میں ہے اور اس ملت کا نصب العین دنیا میں کلمہ توحید کی نشر و اشاعت ہے ۔ حیات ملیہ کی تکمیل فرد کی طرح احساس خودی پیدا کرنے میں ہے اور احساس خودی کی پیدائش و پرورش ملی تاریخ و روایات سے محبت اور لگاؤ میں مضمر ہے ۔

۷۔ نوع انسانی کی بقاء کا انحصار امومت (Motherhood) پر ہے اور امومت کا احترام اور تحفظ اسلام کا اصل الاصول ہے ۔ اس سلسلے میں مسلمان عورتوں کے لیے سب سے کامل نمونہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا ہے ، جن کی ذات تین نسبتوں سے مسلمانوں کے لیے عزیز اور قابل احترام ہے ۔ وہ رسول خدا ﷺ کی دختر نہیں ۔ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی زوجہ اور امام عاشقان حضرت حسینؓ کی والدہ مکرمہ ۔ اولاد کی سیرت گری چونکہ ماں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس

لیے مسلمان مائیں اگر شبیرؓ جیسے بیٹوں سے اپنی گود بھرنا چاہتی ہیں تو ان کے لیے حضرت زہراؓ کی ذات میں ایک بے مثال نمونہ موجود ہے۔

حضرات، یہ تھا "رموز بے خودی" کے مطالب اور مضامین کا ایک مختصر خلاصہ۔ اس سے کم از کم اتنا تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی فکر اور سوچ کا اصل مأخذ و منبع قرآن حکیم اور اسلامی تعلیمات ہیں نہ کہ کوئی لا دینی فلسفہ جس سے ان کی فکر کے ڈانڈے ملانے کی بعض لوگ ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔

تجدید عہد

عالم علیگ

محرم راز کائنات تھا تو
واقف معنیء حیات تھا تو

تیری عقدہ کشائیوں سے کھلا
شارح علم شش جہات تھا تو

قلب مسلم کی وسعتوں کا امین
ذہن آدم کی کائنات تھا تو

علم و دانش کا ابر گوہر بار
شاعر خوبی و صفات تھا تو

حال و ماضی کا ناقد پر مغز
عہد فردا کی ممکنات تھا تو

تیری مینا سے جام بھرتے ہیں
تجھ سے تجدید عہد کرتے ہیں

نظریات اقبال پر ایک نظر

فلائیٹ کیڈٹ خالد محمود اختر

علامہ اقبالؒ مشرق کے عظیم فلسفی شاعر اور مفکر پاکستان کی حیثیت سے ساری دنیا میں مقبول ہیں ۔ ان کے سیاسی ، اجتماعی اور معاشرتی نظریات اور اسلام سے شدید محبت ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیتی ہے ۔ اقبال کو سیاست میں لانے والا محرک صرف وطن کی محبت تھی ۔ وہ آزادی کے انسان کا پیدائشی حق ہونے کے قائل تھے ، لہذا انہوں نے تگ و دو کی کہ انسان کے پیدائشی حقوق تمام اقوام عالم کو بلا تفریق مذہب و ملت ملنے چاہئیں ۔ وہ دین کی شاہراہ سے گزر کر حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے قائل تھے اور علوم شرقیہ میں آپ کو کمال حاصل تھا ۔ اقبال کے کلام میں جلال و جمال ، مہر و قہر نیز رومانیت اور کلاسیکیت و رمزیت کا صحیح امتزاج ہے ۔ وہ حب وطن سے سرشار ہو کر بے اختیار جذباتی رو میں بہہ جاتے ہیں اور ان کے نظریات ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہیں ۔

۱- اقبال کا نظریہ ادب

اقبال کا نظریۂ ادب محض رومانی ، کلاسیکی یا ما بعد الطبیعاتی نہیں ، بلکہ ان تمام نظریات کے چیدہ چیدہ قوانین کا ایک حسین امتزاج ہے ۔ وہ افیون صفت رومانی شاعرانہ نظریات کی بجائے حقیقت پسندی کو شرط اولین قرار دیتے ہیں :

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

وہ یاسیت ، غنودگی ، حزن و ملال اور انفعالیت پھیلانے کے سخت خلاف ہیں اور حالات و وسائل کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لے کر خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ اقبال کے کلام میں گرچہ سادگیٔ بیان کے نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں مگر بالعموم عمیق

خیالات کی موجودگی زبان کو ثقیل بنا دیتی ہے ۔ اقبال بلند عزائم و خیالات کی ترویج کے پیش نظر سلاست زبان پر کم توجہ دیتے ہیں ۔ انھوں نے غزل کی بجائے نظم کو اپنایا ۔ شاید وہ غزل کو فلسفیانہ موشگافیوں نیز گہرے فکر کے اظہار کا متحمل نہیں سمجھتے تھے ۔

۲۔ اقبال کا نظریہ وطنیت

حب وطن کے دو پہلو ہیں ایک سیاسی دوسرا فطری ۔ علامہ اقبال سیاسی پہلو کے سخت مخالف تھے ، کیونکہ یہ دوسری قوموں سے رشک و رقابت اور بغض و عناد پیدا کرتا ہے ۔ وہ وطن کی فطری محبت کے قائل تھے جو نہایت پاکیزہ اور اخلاقی ہے ۔ انھیں ارض وطن کے ذرے ذرے سے پیار تھا مگر وہ ملک و علاقہ ، رنگ و نسل اور زبان کے امتیازات پر قائم ہونے والی قومیت و وطنیت کے محدود نظریے کے قائل نہ تھے ۔ وہ فرد کو قطرہ اور قوم کو دریا سمجھتے تھے اور اس محدود نظریے کو ایک بے جان بت قرار دیتے تھے ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نظریۂ وطنیت کے عملی مشاہدہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ محدود مادی نظریۂ وطنیت سے چھوٹی چھوٹی بے وقعت قومیں تو بن سکتی ہیں مگر کوئی ہمہ گیر اور آفاقی قوم تیار نہیں ہو سکتی ۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں تو تیار ہو سکتی ہیں مگر بحرِ بے کراں پیدا نہیں ہوسکتا ۔ چنانچہ انھوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو دعوت دی کہ :

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی نہ افغانی
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

انھوں نے کہا کہ میں انسانوں کو صرف ازلی ، ابدی اور روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور اسلام سے میری مراد روحانی نظام ہے ۔

۳۔ اقبال کا نظریہ' عقل و عشق

اقبال کے ہاں عشق ہمیشہ فاتح اور عقل ہمیشہ رسوا رہی ہے ۔ عشق شعور ، جذبہ اور آزادی کی آبیاری کرتا ہے اور کائنات کے راز فاش کرتا ہے مگر عقل بقول اقبال

عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم　　　عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

اقبال کے مطابق عقل انسان کو مرتکز کی بجائے منتشر کرتی ہے اور وحدت یکرنگی میں خلل ڈالتی ہے ، نیز اس میں جرأت ، استقامت اور جانبازی کا فقدان ہوتا ہے جب کہ عشق بے باک ہوتا ہے :

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

۴۔ اقبال اور نسوانیات

ادب میں وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ زندگی کو محض خواہشات اور جنسی تلذذ کی نظر سے دیکھا جائے ۔ انھوں نے ادیبوں اور فن کاروں کے اس پہلو کی مذمت کی اور کہا :

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند　　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　　آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

وہ تعلیم نسواں کے قائل تھے مگر سال خواتین کی طرح آزادی کے قائل نہ تھے ، لہذا کہتے ہیں :

نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد　　　نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا　　　اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

۵۔ اقبال اور تنقید

اقبال کے تنقید کے دو پہلو ہیں ۔ اول سماجی و معاشرتی اور دوم ادبی ۔ اقبال کی معاشرتی تنقید کے پس پردہ ایک صحیح اسلامی معاشرے کے قیام کی زبردست خواہش کار فرما ہے ، تبھی انھوں نے ایک علیحدہ نظریاتی مملکت بنانے کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں

جیسے نار نمرود اور فرعون کے مظالم بھی تسخیر نہ کر سکے۔ آپ نے ایک خط میں لکھا: "جب خودی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے"۔ انھوں نے خودی کی تربیت کے لیے تین مراحل کو لازمی قرار دیا :

(الف) اطاعت آئین

احکامات خداوندی کی پابندی انسان کا فرض ہے اور اس کے مصالح اور حکمتوں کا جاننا اس کا کام نہیں ۔ رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع ، صبر و تحمل اور استقلال سے کی جائے ۔

(ب) ضبط نفس

خودی کی تربیت کے راستے میں مال و دولت ، حب وطن ، خویش و اقربا پروری کی محبت نیز خوف دنیا ، خوف عقبیٰ ، خوف جان اور خوف آلام سے ذہنی طور پر متأثر ہونا ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔

(ج) نیابت خداوندی

انسان پہلے دو مراحل سے گزر کر ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ خدا کا نائب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ وہی اقبال کا مرد مومن ہے کیونکہ بقول اقبال :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں ۔ کار کشا ۔ کار ساز

مختصراً اقبال نے شاعری کے اس دھارے کو جو ولی دکنی کے وقت سے بہہ رہا تھا موڑ کر ملّی نشاۃ ثانیہ کے سیراب کرنے کے لیے پیش کر دیا ۔ واقعی وہ اپنے دور کے مجدد تھے اور قوم کے نجات دہندہ اور گلشن اسلام کے باغبان تھے ۔

علامہ اقبالؒ

فلائٹ کیڈٹ خالد محمود اختر

اے شعور وطن ما اے شاعر مشرق عظیم
اے پیمبر، رہبر عشق و خودی، مرد کلیم

گلشن اسلام کی عظمت کے طوطی خوشنوا
بزم سوز و ساز کے رنگیں بیاں شعلہ نوا

تو سراپا قصۂ عشق و وفا، ساز و صدا
اے محبت کی نوا تھی عرش پر تیری وفا

کاش اپنے دور کا ہوتا جو میں شعلہ بیاں
شان میں کہتا تری وہ نظم کہ سنتا جہاں

ماہ و انجم سے رفیع تیرے تصور کا مقام
نوجوانوں کی جواں پر سوز روح تیرا کلام

دین کامل اور خودی کے فلسفے کا تو امیں
آدم خاکی تھا پر بام ثریا کا مکیں

تیرے شعر و فکر، علم و عمل کی زریں قبا
تیرے قول حق نمود صبح کی مہکی صبا

ملت اسلام کے اے اختر عالی مقام
کرتے ہیں شاہیں صدق دل سے تیرا احترام

دو عظیم ہم عصر

فلائٹ کیڈٹ انڈر آفیسر غلام مجدد

مجدد عصر

کچھ لوگ بارش کے قطروں کی طرح خدا کا تحفہ ہوتے ہیں جو آسمانوں سے انسانی ذہن کی کھیتیوں پر گرتے ہیں، تو وہاں سے علم و حکمت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں - انہی لوگوں کے دم سے انسانیت کی فکر جو ان اور حسن قائم رہتا ہے - ہمارے فلسفی شاعر علامہ محمد اقبالؒ، خدا کا ایسا ہی تحفہ تھے جنہوں نے اپنی فکر اور فن سے بنجر ذہنوں کی آبیاری کی - اندھیرے میں راہبری کے چراغ روشن کیے - امت کی رگوں میں زندگی کی تراوٹ دوڑائی اور نوع انسان کو عزت نفس کا سبق دیا -

جس وقت خدائے بزرگ و برتر نے علامہ اقبال کو دنیا میں پیدا کیا، وہ وقت ایسا تھا کہ مسلمان امت کو حقیقی طور پر ایک ایسی قوت اور فکر کی ضرورت تھی جو مذہبی اقدار پر ان کا یقین پختہ کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کرے - علامہ نے وقت کی اس ضرورت کو بڑی خوبصورتی سے پورا کیا اور دنیا کے مسلمانوں میں اخوت، یگانگت، خود اعتمادی اور مسلم تشخص کا احساس پیدا کیا - انہوں نے جدید دور کی فکری اور سائنسی ترقی کو اسلامی فلسفے کا ثمر قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو زمانے کی قید سے آزاد ہے اور اس میں اتنی صلاحیت اور قوت ہے کہ یہ بنی نوع انسان کی راہبری کر سکے -

علامہ کی نگاہ میں انسانی عظمت کا معیار سرور کونین ﷺ کی ذات مبارک تھی - اس لیے ان کا یہ ایمان تھا کہ اتباع رسولؐ، عام آدمی میں ایسی خصوصیات پیدا کر سکتا ہے جو اسے تمام عالم سے ممتاز اور افضل کر دیں اور کائنات کی وسعتیں اس کے آگے حقیر

ہو جائیں ۔ علامہ کی فکر کا ماخذ قرآن حکیم ہے جو ازلی حکمت کا بے بہا خزانہ ہے ۔ علامہ کی تعلیم اور وسیع مطالعے کی بدولت جدید دور کے تمام سائنسی افکار ان کے ذہن میں تھے۔ قرآن حکیم کے بغور مطالعے اور اپنے علم کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید سائنسی ترقی اسلام کی سچائی پر ایک روشن دلیل ہے ۔

اقبال فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی ۔ اپنے فلسفے اور افکار کے اظہار کے لیے انہوں نے شاعری کو استعمال کیا ۔ یہ اپنی نوعیت کی دلچسپ اور عجیب و غریب حقیقت ہے کیونکہ فلسفہ اور شاعری دو متضاد چیزیں ہیں ۔ فلسفہ حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے ۔ فلسفی کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے ۔ مگر شعر حقیقت کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تصویر ہے اور شاعر نبض حیات کی تڑپ اور قلب حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے ۔ علامہ اقبال میں ان دونوں حقیقتوں نے ایک ہی شکل اختیار کر لی ہے اور وہ اقبال کا فن بن گئی ہیں ۔

علامہ ہمارے وطن عزیز کے مصور اور عصر حاضر کے مجدد ہیں ۔ امت محمدی اور انسانیت کے لیے ان کی خدمات گرا نمایہ اور قیمتی ہیں ۔ اس لیے تمام انسانوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے اقبال کو پڑھنا ، سمجھنا اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنا از حد ضروری ہے ۔ انہوں نے ہمارے لیے جو نظریاتی سرحدیں وضع کی ہیں ان کی وسعت لا محدود ہے ۔ ہم نہ صرف مملکت اقبال کے محافظ ہیں بلکہ اس کی فکری اور نظریاتی سرحدوں کے امین بھی ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا فرض بڑا اہم اور کٹھن ہے۔ لیکن علامہ محترم نے ہمیں جد و جہد، سخت کوشی اور سعیء مسلسل کی ترغیب دی ہے ۔ اور یہ سکھایا ہے کہ زندگی کا مزا ہی مشکلات اور کٹھن حالات کا مقابلہ کرنے میں پوشیدہ ہے ۔

ہمیں اپنے اندر خودداری ، اعلی ظرف ، مشکل پسندی اور بلند پروازی کی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں جو اقبال کے شاہین کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ ان خصوصیات کی بدولت ہم مجدد عصر کے فلسفے کی زندہ تصویر ہونے کا اعزاز حاصل کر سکتے ہیں اور دنیا میں اپنے لیے با عزت اور با وقار مقام بھی پیدا کر سکتے ہیں ۔

قائد عصر

کسی نے کہا ہے کہ بڑا آدمی آسمان سے گرنے والی بجلی کی طرح ہوتا ہے اور عام آدمی ایندھن کی طرح، جو اس بجلی کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ اس کی بدولت وہ بھی آگ پکڑ لے۔ یہ بات ہمارے محبوب راہنما، حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے میں بالکل صحیح ہے۔ انہوں نے تن تنہا برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکھٹا کیا۔ اپنی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ ترین قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت ان مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن بھی حاصل کیا۔

قائداعظم کی مشکلات سے ان کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی منتشر جمعیت، معاشی پسماندگی، تعلیمی انحطاط اور بے اعتمادی، الغرض بیسیوں مشکلات تھیں جن کا انہوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور بالآخر مشکلات کے منہ زور طوفان نے قائداعظم کی آہنی شخصیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

قائداعظم نے مسلمانوں کو ایک منزل کا سراغ دیا اور منزل کے بارے میں ان کا یقین پختہ کیا جس کی بدولت مسلمان ایک مستحکم قوم کی حیثیت سے ابھرے۔ شروع میں حصول منزل ایک ناممکن کام دکھائی دیتا تھا، کیونکہ انگریز اور ہندو، مسلمانوں کے سخت ترین مخالف تھے۔ لیکن قائداعظم کی پامردی، قوت ارادی اور اپنی صداقت پر غیر متزلزل ایمان نے تمام مخالفتوں کو ناکام و نامراد بنا دیا اور کامیابی مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ جب کامیابی اتنی عظیم ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ پاکستان کا قیام بھی ایک معجزہ ہے اور اس کا اعجاز وہ قیادت اور روح ہے جو ہمارے محبوب راہنما نے ہمیں بخشی۔

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ قدرت نے بڑے لوگوں کے اوصاف اور خوبیوں کی کوئی علیحدہ فہرست بنائی ہوئی ہے۔ مگر قائداعظم کی ذات کے تجزیے سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ بڑے لوگوں میں بھی وہی چھوٹی، عام اور سادہ خوبیاں ہوتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ عام آدمی میں صرف یہ خوبیاں ہوتی ہیں، مگر بڑے آدمیوں میں ان کی روح اور جوہر

معمار پاکستان کے ایام آخریں

فلائیٹ کیڈٹ سہیل شفیع چغتائی

کسی بھی سیاسی نظریہ کو لیجیے اگر اس کا منبع اور ماخذ معلوم کرنا چاہیں تو انکشاف ہوگا کہ وہ کسی ایسی سر زمین سے ابھرا ہے جسے سیاسی اختلافات اور تصادم نے جھلسا دیا تھا ۔ مسلمانان ہند کے دو قومی نظریے کے بارے میں اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں ۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کے نتیجے میں پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھرا ۔

جب ایک قوم کی تاریخ کے کسی دور پر مایوسی اور نا امیدی کے بادل چھا جاتے ہیں تو اس میں ایک مرد دانا کی آمد امر ناگزیر ہوتا ہے ۔ اس مرد دانا کا اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے نصب العین پر یقین کامل ، ایک لافانی کارنامے کی مضبوط و مربوط اساس بن جاتا ہے ۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے بیسویں صدی کا پہلا نصف ایک ایسے ہی دور کا آئینہ دار تھا ۔ مسلمان جس سیاسی محاذ پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو تسلیم کرانے کی جنگ میں مصروف تھے وہاں قائداعظم محمد علی جناح ان کے سپہ سالار تھے ۔ اقوام کی جدو جہد کی تاریخ میں مرد دانا کا کام اپنی قوم کو عفریت مصائب سے بچا کر، کشمکش کے سیل تند و تیز میں ناؤ کھیتے ہوئے ساحل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ قائداعظم کا لافانی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کی راہنمائی کی اور اسے منزل مراد تک پہنچایا ۔ ان کے اسی کارنامے کی بنا پر قوم نے اپنے معمار کو بجا طور پر بابائے قوم کا خطاب دیا ۔ جناح اور پاکستان ــ یہ دو الفاظ اس قدر مربوط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی محال ہے ۔ بنا بریں حیات قائداعظم درحقیقت قیام پاکستان کی داستان ہے ۔

قائداعظم کے استقلال بے پایاں اور جذبہ گراں مایہ نے گو کشتی ساحل پر لگا دی ، لیکن اس قوت و ارادہ اور بلند پایہ ہمت نے جو اس عظیم مقصد میں صرف ہوئی ملاح کو ناتواں کر دیا ۔ مگر یہ ناتوانی صرف جسمانی حد تک تھی ۔ ورنہ ان کا حوصلہ بدستور جوان تھا ۔

کی طرح انہیں بھی تنہائی مرغوب تھی مگر عوام کے درمیان ان کی جادو اثر شخصیت کچھ اور ہی کام کرتی ۔ ان کے دل کی دھڑکن عوام کے دل کی دھڑکن بن جاتی ۔ تقدیر انہیں منزل سے قریب تر کر رہی تھی کہ ان کی صحت جواب دینے لگی ۔ دس کروڑ عوام کا رہنما تاریخ کے اس نازک موڑ پر کس طرح انہیں چھوڑ کر آرام کر سکتا تھا ۔

پاکستان مختلف النوع مسائل کی نہج پر وجود میں آیا تھا ۔ مہاجرین کا ایک سیل رواں تھا جو کہ امڈا چلا آ رہا تھا ۔ ان کی دیکھ بھال ، ان کے قیام کا انتظام یہ سب کچھ قائداعظم کی ذمہ داری تھا اور وہ اس ذمہ داری سے اپنی صحت کی قیمت ادا کر کے عہدہ برآ ہو رہے تھے ۔ پاکستان میں یاس و نا امیدی کے بادل منڈلا رہے تھے ۔ انہوں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں لوگوں کے عظیم الشان جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : "ہم خدا کے حضور سربسجود ہیں کہ اس نے ہمیں ان مصائب سے نمٹنے کی ہمت عطا فرمائی ۔ اگر ہم قرآن حکیم کو اپنا رہنما بنا لیں تو یقین کریں کہ آخری فتح ہماری ہو گی" ۔ قائداعظم جس وقت تقریر کر رہے تھے تو شدت جذبات سے ان کی زبان سے پورے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی جلسہ عام میں موت کا ذکر کیا ۔ انہوں نے فرمایا : "اپنا حوصلہ بلند رکھیے ، موت سے خوفزدہ نہ ہوں ۔ ہمارے مذہب نے ہمیں بتلایا ہے کہ ہم سفر آخرت کے لیے ہر وقت تیار رہیں ۔ اپنا فرض انجام دیجیئے اور خدا پر کامل اعتماد رکھیے ۔ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا وجود ختم نہیں کر سکتی ۔ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا" ۔

دن رات میں تبدیل ہو رہے تھے اور راتیں صبح کی روشنی سے ہمکنار ہو رہی تھیں اور یوں وقت اڑا جا رہا تھا ۔ لیکن قائداعظم کے معمولات میں ذرہ بھر بھی تغیر رونما نہ ہوا تھا ۔ اب بھی ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث کرتے تھے ۔ ملک بھر میں ان کے دورے اسی تیزی سے جاری تھے اور بالکل اسی تیزی سے ان کی صحت جواب دے رہی تھی ۔ اگر وہ ڈاکٹروں کے پر زور اصرار پر چند روز آرام فرما لیتے لیکن اس آرام میں بھی وہ اپنے آپ کو ملکی امور سے پوری طرح باخبر رکھتے تھے اور ضروری فائلوں پر دستخط کیا کرتے تھے ۔

قائداعظم نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کی دعوت قبول کر لی تھی - اگرچہ ان کی صحت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی ، تاہم اس موقع پر ان کی تقریر کے اس جملے سے ہی واضح ہو گیا کہ انھوں نے کن اسباب کی بنا پر اس تقریب میں شرکت کی - انھوں نے فرمایا : «سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح سے مالی امور میں ہماری مملکت کی خود مختاری کا باب شروع ہوتا ہے» - اس تقریر کے دوران یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی کہ قائد کی صحت حد درجہ متاثر ہو رہی ہے - ان کی آواز بمشکل سنائی دیتی تھی - وہ تقریر کے دوران میں بار بار کھانس رہے تھے اور اکثر انھیں سانس لینے کے لیے رکنا پڑتا تھا - لیکن جسمانی کمزوری کے باوجود ان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا -

ڈاکٹروں کی ہدایت پر قائداعظم کو کوئٹہ منتقل کر دیا گیا تھا اور پھر وہاں سے انھیں زیارت لے جایا گیا جو کہ نسبتاً ٹھنڈا مقام تھا - قائداعظم کا قیام وہاں قدیم طرز کی رزیڈنسی میں تھا - وہاں بھی قائداعظم کام سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر سکے - وہاں دو فرلانگ تک کے فاصلہ کے لیے قائداعظم چہل قدمی کیا کرتے تھے اور پھر پیرا کی کے تالاب کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ جاتے اور یہ ان کا معمول تھا - قائداعظم کی علالت زیادہ تشویشناک ہوئی تو ممتاز معالج کرنل الہی بخش کو طلب کیا گیا - یہ جولائی کا آخر تھا - جسمانی کمزوری کے باوجود قائد چاق و چوبند تھے - ان کی طبیعت کی جولانی میں کوئی فرق نہ آیا تھا - انھوں نے اپنی زندگی میں کئی معرکے سر کیے تھے اور اب پورے اعتماد کے ساتھ صحت کی خرابی کے خلاف نبرد آزما تھے - تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ قائداعظم کے پھیپھڑوں پر ورم ہے اور وہ تقریباً دو سال سے اس بیماری میں مبتلا ہیں - اس پر قائداعظم نے تعجب کا اظہار کیا کیونکہ وہ گذشتہ تیس برس سے روزانہ بارہ گھنٹے کام کر رہے تھے اور کبھی کوئی شدید تکلیف محسوس نہ کی تھی - یہ اور بات تھی کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے باوجود انھوں نے کبھی آرام نہیں کیا -

اس سال ۲۷ اگست کو عید الفطر تھی اور قائداعظم عید کے پیغام کی تیاری میں مصروف تھے - قوم کے نام ایک پیغام میں انھوں نے فرمایا : «مشترکہ کوششوں اور اپنے

نصب العین پر یقین کامل ہی سے ہم پاکستان کو ایک حقیقت میں تبدیل کر سکیں گے ۔ ہم متحد ہو کر ہی دنیا تک اپنی آواز کو پہنچا سکتے ہیں ۔ لہذا میں آپ سے اپیل کرتا ہوں ۔ آپ یہ بات کسی طرح بھی کہہ لیں ۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ۔ ہر مسلمان کو پوری دیانت و خلوص سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے؛ ۔

یہ قائداعظم کے آخری الفاظ ثابت ہوئے ۔

ستمبر کے اوائل میں قائداعظم کے ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ان کے صحت یاب ہونے کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں ۔ کوئٹہ کی آب و ہوا ان پر مضر اثر کر رہی تھی ۔ جو لوگ ان سے قریب تھے وہ مایوس ہوتے جا رہے تھے ان کی زندگی کی ساعتیں ایسے وقت کم ہو رہی تھیں جب قوم کو ان کی اشد ضرورت تھی۔ ۱۱ ستمبر کو گورنر جنرل کے طیارے وائی کنگ کے ذریعے قائد کو کراچی لایا گیا ۔ قائداعظم کو ایمبولینس میں منتقل کر دیا گیا۔ تقریباً چار میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایمبولینس کے انجن میں کچھ خرابی ہو گئی ۔ گاڑی رک گئی ، اس روز خلاف معمول کراچی کا درجہ حرارت ناقابل برداشت حد تک گرم تھا ۔ دوسری ایمبولینس کا انتظار ہونے لگا۔ قریب ہی مہاجرین کی سینکڑوں جھونپڑیاں تھیں ۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کا قائد اس وقت ایک ایمبولینس میں لیٹا زندگی کے آخری معرکے سے نبرد آزما ہے ۔ قائداعظم بے بسی کے عالم میں ایمبولینس میں لیٹے ہوئے تھے۔ ایک قیمتی زندگی کا انجام قریب تر آ رہا تھا ۔ ہر سانس کے ساتھ زندگی گھٹتی جا رہی تھی ۔

رات ساڑھے نو بجے قائداعظم نے شدید تکلیف کا اظہار کیا ۔ نو بج کر پچیس منٹ پر ڈاکٹر الٰہی بخش نے جھک کر سرگوشی میں کہا : "جناب عالی ہم نے آپ کو طاقت کا انجکشن لگایا ہے ، جلد ہی فرق محسوس ہوگا ۔ انشاء اللہ آپ زندہ رہیں گے" ۔ قائداعظم نے اپنے سر کو جنبش دی اور نحیف و زار آواز میں گویا ہوئے : "نہیں میں زندہ نہیں رہ سکوں گا" ۔ یہ ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا آخری کلمہ تھا ۔ چند منٹ بعد جب وہ محو خواب تھے تو انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔

نذر قائد

فلائٹ کیڈٹ انڈر آفیسر **غلام مجدد صوفی**

ایسا کہاں سے لائیں وہ جتنا عظیم تھا
ثابت قدم تھا پیکر عزم صمیم تھا

قدرت نے انتخاب کیا اپنے ہاتھ سے
قائد تھا گویا بخشش رب کریم تھا

اقبال کے تصور مؤمن کا نقش تھا
پر عزم پر وقار تھا بے حد فہیم تھا

تاریکیوں کے خول سے نکلا مثال مہر
وہ ابتلاء کے طور کا مرد کلیم تھا

اپنے جلو میں فصل بہاراں لیے ہوئے
جھلسے ہوئے چمن میں وہ باد نسیم تھا

صوفی ہم اس کی یاد سے غافل ہوں کس طرح
ٹھوکر سے جس کی کوہ غلامی دو نیم تھا

★

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

خلیق قریشی ، ایم ۔ اے

۲۱ فروری کا دن ہمارے لیے قیامت کا دن تھا ، کون سی آنکھ تھی جو اشک بار نہ تھی ۔ بی ۔ اے ۔ ایف کالج کیمپس میں کون سا دل تھا جو سوگوار نہ تھا ۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا ۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اتوار (۲۰ فروری) کو تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے ۔ ایک صاحب نے کہا: آج صبح ہی ریلوے سٹیشن پر فصیح صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی ۔ بہت گرمجوشی سے ملے تھے ۔ میں کیا کہہ سکتا تھا ، میری تو ڈیڑھ بجے بھی ہسپتال میں فصیح صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے بیٹوں شاہد اور خالد کو بلوا دوں ۔ انہوں نے کہا: نہیں خواہ مخواہ پریشان ہوں گے ۔ یہ بات خاصی امید افزا تھی ۔ جب ان کے جسد خاکی کو ہم لوگ ان کے دولت کدے پر لائے تو شام پانچ بجے کا عمل ہوگا ۔ ان کے طلبہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی ۔ وہ حیران و پریشان تھے ۔ اکثر کو تو فصیح صاحب کے ہسپتال داخل ہونے کا بھی علم نہ تھا ۔ انہوں نے تو پہلی خبر ہی ان کے متعلق اس عالم فانی سے رخصتی کی سنی اور سنتے ہی جیسے ان کے ہوش و حواس پر بجلی گر گئی ہو ۔ اکثر طلبہ دیوانہ وار بچھاڑیں کھا رہے تھے ، فصیح صاحب کا سلوک اپنے طلبہ کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا ۔ انہوں نے سرپرستی کی بجائے ہمیشہ انہیں دوستی کا احساس دلایا ۔ آج اس مشفق استاد کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ گیا تھا ۔ رفقائے کار سے ہمیشہ تہذیب و شرافت سے پیش آنا ان کی فطرت میں شامل تھا ، دوستوں سے محبت اور خلوص میں فراخدلی کا بحر زخار تھے ۔ اپنے بیٹوں کے باپ ہی نہیں بلکہ بہت اچھے دوست تھے ، شائستہ اور مہذب احباب کے درمیان ایک اہم کڑی تھے ۔ جب کسی دوست سے ملوانا مقصود ہوتا تو کہتے وخلیق صاحب آپ فلاں صاحب سے نہیں ملے؟ —— کیا بات ہے صاحب بہت نفیس اور باذوق انسان ہیں ، آپ کی طبعیت ان سے مل

کر بہت خوش ہوگی» ۔ ادھر ایسے ہی کلمات میرے بارے میں ان سے کہنے اور پھر دونوں کو ملوانے ، ایسی ملاقات جس پر پہلے ہی وہ پھول برسا چکے ہوں بھلا سدا بہار کیوں نہ ثابت ہوتی ــ ان کی میت ایک بستر پر رکھ دی گئی جو برآمدے میں لگا دیا گیا تھا ، کیمپس اور کیمپس سے باہر کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے اور بہت نظم و ضبط کے ساتھ اپنے دوست ، رفیق ، شفیق اور ایک شریف اور بھلے مانس کا آخری دیدار کر رہے تھے ۔ کسی نے کہا: «فصیح صاحب تو سو رہے ہیں ، ابھی اٹھ بیٹھیں گے اور کہیں گے ارے آپ لوگ باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیے» ــــ اگربتیوں کی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی ، بہت ساری شہد کی مکھیاں جیسے فضا میں بھنبھنا رہی ہوں ۔ دراصل یہ گونج تھی طلبہ کے قرآن شریف تلاوت کرنے کی ــــ کالج کے پرانے طلبہ جو اب ونگ کمانڈر اور سکواڈرن لیڈر کے عہدوں پر تعینات تھے اپنے استاد کے دیدار کے لیے پہنچ رہے تھے ۔ فصیح صاحب کی ناگہانی موت کی اطلاع ہر طرف پھیل چکی تھی ۔ ان افسران میں سے اکثر فصیح صاحب کے ہاؤس کے لڑکے تھے جو تیرہ سال کی عمر میں اس کالج میں ساتویں کلاس میں داخل ہوئے تھے اور پانچ سال فصیح صاحب کی سرپرستی میں سینئر کیمبرج کرنے کے بعد تربیت کی تکمیل کی خاطر رسال پور گئے تھے ۔ آج یہ لوگ گم سم غم کی تصویر بنے بیٹھے وہ دن یاد کر رہے تھے جب فصیح صاحب انہیں ایک اچھا افسر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا انسان بننے کی تربیت دیا کرتے تھے اور جو کچھ آج یہ تھے اس میں فصیح صاحب کا کتنا حصہ تھا ۔ فصیح صاحب کرکٹ کے عمدہ کھلاڑی تھے ، مسٹر کیج پول جو خود بھی کرکٹ کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے کہا کرتے تھے :

"It is a treat to watch Fasih batting"

حقیقت میں فصیح صاحب کی فن کارانہ بیٹنگ ایک ایسی خوبصورتی تھی جسے جان کیٹس نے «ابدی مسرت» سے تعبیر کیا تھا ۔ آج وہ فن کار بیٹس مین رن آؤٹ ہوگیا اور ایمپائر کی انگلی اٹھنے سے پیشتر ہی پیویلین میں واپس چلا گیا اور کبھی واپس نہیں آئے گا ۔ کاش فصیح صاحب قوانین اور ضابطوں کے اس قدر پابند نہ ہوتے اور وکٹیں بکھرنے ہی آدھے راستے میں فیلڈ سے باہر نہ نکل آتے :

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

رات کے گیارہ بج رہے تھے لیکن لوگوں کا ہجوم اسی طرح دیدار کے لیے آ رہا تھا۔ طلبہ بریب روم میں قرآن خوانی کر رہے تھے، وہی بریب روم جہاں فصیح صاحب طلبہ سے خطاب کیا کرتے تھے۔ فصیح صاحب کی آواز بہت خوبصورت اور منفرد تھی، احباب اکثر کہا کرتے تھے: «آپ کی آواز میں اس قدر ڈرامائیت ہے کہ آپ کو ٹی۔ وی یا ریڈیو کارپوریشن میں ہونا چاہیے تھا»۔ فصیح صاحب تقریر بہت عمدہ کرتے تھے؛ انگریزی لاجواب بولتے تھے اور لاجواب لکھتے تھے۔ انگریزی کا تلفظ اتنا درست اور لہجہ اتنا نرم اور شیریں تھا کہ انگریز رشک کرتے تھے، یہ شوق انہیں شروع سے تھا اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے انہیں خاصی ریاضت کرنا پڑی تھی۔ گھنٹوں بی۔بی۔سی سنتے تھے اور ایک ایک لفظ کے تلفظ پر دھیان دیتے تھے۔ اخبار میں خطوط لکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، زیادہ تر کرکٹ اور جغرافیہ کے موضوع پر خطوط لکھتے تھے۔ ایک دفعہ ظہیر عباس کے سلسلے میں ان کی بحث پاکستان ٹائمز کے کالموں میں بریگیڈیر پیک ووڈ سے چھڑ گئی، ایسے ایسے عمدہ اور مدلل خطوط فصیح صاحب نے لکھے کہ بریگیڈیر صاحب بھی چوکڑی بھول گئے۔ کرکٹ کے facts and figures میں فصیح صاحب کا کون مقابلہ کرتا۔ دلی سے ہجرت کے وقت جو مختصر سامان اپنے ہمراہ لا سکے ان میں کرکٹ کے رسالوں کا انبار بھی شامل تھا۔ ہمیشہ اس انمول سرمایہ کو باعث افتخار سمجھتے تھے ــــــ بریب روم میں قرآن خوانی ہو رہی تھی وہیں دیوار پر ایک بڑا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ کرکٹ کے علاوہ دوسری چیز جس سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ تھا وہ ان کا مضمون جغرافیہ تھا۔ ایک بڑے افسر جو پی۔ ایم۔ اے میں فصیح صاحب کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا: «پاکستان میں ملٹری جیو گرفی کے اساتذہ میں فصیح صاحب کا کوئی ثانی نہیں ہے»۔ فصیح صاحب کو اس بات کا بے حد ملال تھا کہ پاکستان کے ناخدائے تعلیم جغرافیہ کے مضمون کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اتنا اہم مضمون ہے کہ «جہاں گیری» اور «جہاں بانی» کی تربیت اس کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی تھی ــــــ اب صرف طلبہ اور خواتین قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ جنازہ

دوسرے روز صبح اٹھایا جانا تھا ، پوری رات قرآن خوانی فصیح صاحب کی نیکی کی منہ بولتی شہادت تھی ۔ اس شخص نے اپنی زندگی میں کسی کو ضرر پہنچانے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ دوسرے روز صبح فصیح صاحب کی بہنیں ، بہنوئی اور بیگم فصیح کے بھائی معہ اپنی بیگمات پہنچ چکے تھے ۔ محترمہ اے ۔ آر خاتون (پاکستان کی معروف ناول نگار خاتون) کے دو ہی صاحبزادے تھے ۔ چھوٹے کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا ، فصیح صاحب بڑے صاحبزادے تھے ۔ ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے اور فوج کی ریزرو میں کیپٹن تھے ۔ دوسری جنگ عظیم میں محاذ پر شہید ہوگئے تھے ۔ فصیح صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ۔ اے کیا تھا ۔ پاکستان آنے کے کچھ عرصے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں جغرافیہ پڑھایا ، پھر انٹر سروسز انٹیلیجنس ڈائریکٹوریٹ میں سویلین گزیٹڈ آفیسر تعینات ہوئے ۔ اس کے بعد J.S.P.C.T.S. کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہے ، اسی دوران ان کی شادی صمدانی صاحب کی صاحبزادی زبیدہ صمدانی سے ہوئی ۔ کوئٹہ سے ٹرانسفر ہوکر پی ۔ ایم ۔ اے کاکول میں انسٹرکٹر رہے ۔ وہیں کمیشن ملا ۔ اپنی والدہ سے قریب رہنا چاہتے تھے ، فوج سے رسیاں تڑا کر ۱۹۵۹ء میں پی ۔ اے ۔ ایف پبلک سکول سرگودھا میں الیکر ہاؤس میں میں بطور ہاؤس ماسٹر تعینات ہوئے ۔ پبلک سکول پی ۔ اے ۔ ایف کالج بنا، ایف۔ ایس سی سے بی ۔ ایس سی تک بڑھایا گیا ، الیکر ہاؤس کا نام منیر ہاؤس رکھا گیا ۔ منیر ہاؤس سے منیر سکواڈرن ہوا ، فصیح صاحب آفیسر انچارج سکواڈرن کہلائے ـــــ جنازہ تیار ہو چکا تھا ، دل ہلا دینے والا منظر تھا ۔ اب تک ہم سب کو ایک عارضی سا اطمینان تھا کہ فصیح صاحب گھر میں سو رہے ہیں ۔ لیکن اب تو رخصتی کا منظر تھا ، وداع کا وقت تھا ، مستقل جدائی کا لمحہ تھا ، کہار ڈولا اٹھانے کو کھڑے تھے : "سکھی ری ڈولی پہ ہو جا سوار ، تیرے ساجن کھڑے ہیں دوارہ ۔ سجنی کو نہلا دھلا کر اور بنا سنوار کر تیار کر دیا تھا ، گلاب چھڑکا جا رہا تھا :

چل ری سجنی اب کیا سوچے

جنازہ مختلف کندھوں سے ہوتا ہوا فٹ بال فیلڈ نمبر تین تک پہنچا ۔ یہ وہ فیلڈ تھا جہاں فصیح صاحب فٹ بال گروپ لیا کرتے تھے ۔ ہاؤس پریکٹس کے لیے یہ گراؤنڈ

طبیعت ایسی تھی کہ وہ کسی سے بھی زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتے تھے ۔ ان کو منانا بہت ہی آسان تھا لیکن اب کی دفعہ ایسے روٹھے کہ منانے کے لیے بیوی ، بچے ، اقربا ، احباب غرضیکہ پورا کالج رو رہا ہے اور یہ ہیں کہ کسی کی ایک نہیں سن رہے ۔ فصیح صاحب ایسے سنگ دل تو کبھی نہ تھے ، ہماری نہ سنیے ، ہماری کیا بات ہے لیکن منے کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے ہی آ جائیے :

منے کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

بچوں کے ساتھ دوستوں اور ہم جولیوں کا سا رویہ تھا لیکن رعب اتنا تھا کہ بس اشارہ کافی ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے ہمیں بھی ساتھ جانا تھا ، منے نے ضد کی کہ میں بھی جاؤں گا ۔ منا امی کے ساتھ چپکے چپکے کھسر پھسر کر رہا تھا ، اتنی مجال نہ تھی کہ ابا سے براہ راست کہتے ۔ فصیح صاحب کو پتہ چلا تو بس ایک آواز دی «منے» اور آنکھیں نکالیں ، بس اتنا ہی کافی تھا ۔ بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی ۔ ان کے ساتھ کھیلتے بھی تھے انہیں اپنے ساتھ سلاتے بھی تھے ۔ انتقال سے ایک روز پہلے بیگم تو ہسپتال میں تھیں اور یہ اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لٹائے ساری رات پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی کرکٹ کومینٹری سنتے رہے ۔ (پانچویں بیٹے اس وقت بنکاک میں تھے) ۔ شروع شروع تو مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں موسیقی سے خاص لطف اندوز نہیں ہوتا ۔ لیکن جب سے راشد نے (جو مرچنٹ نیوی میں افسر ہیں) ٹرانسسٹر مع کیسٹ پلیئر لا کر دیا تھا ، فصیح صاحب موسیقی سے خوب حظ اٹھانے لگے تھے ۔ ایس ڈی برمن سے بہت متأثر تھے ۔ آخر میں تو موسیقی میں محو ہونے لگے تھے ، جب بھی نیا گانا ریکارڈ کرتے مجھے اور میری بیگم کو بلا کر لے جاتے اور مجاہد سے گانا لگانے کو کہتے ، کسی کو درمیان میں گفتگو نہ کرنے دیتے ، راشد کی لائی ہوئی نوادرات بڑے ناز اور افتخار سے سب کو دکھاتے ۔ یہ گڑیا شنگھائی سے لایا ہے ۔ یہ ایر گن ، یہ کلاک ، یہ کیسٹ شیلف ——
راشد سیلون سے چائے کے پیکٹ لائے تو اپنے قریبی احباب میں ایک ایک پیکٹ تقسیم کیا ۔ ایک مرتبہ میں نے ان کی ایک ٹائی کی تعریف کر دی ، شام کو مجھے اپنے گھر لے گئے اور بصد اصرار وہ ٹائی تحفۃً مجھے دے دی اور بہت صداقت اور خلوص سے کہنے

لگے کہ زیادہ مہنگی نہیں ہے لیکن آپ کو پسند ہے ، اب وہ ٹائی بطور تبرک میرے پاس رہے گی ۔ انتقال سے ہفتہ پہلے راشد کا خط کسی جزیرے سے آیا ، بڑے شوق سے مجھ سے پڑھوایا ۔ بڑا ہی بے تکلف خط تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے ۔ اس میں Sex free ports وغیرہ کا ذکر تھا ۔ کہنے لگے : میں تو جغرافیہ پڑھاتا ہوں ، یہ لڑکا جغرافیہ دیکھ رہا ہے ۔ فصیح صاحب کی ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ وہ دوسرے ممالک کی سیر کریں ۔ افسوس ان کا یہ ارمان صرف اس طرح پورا ہوا کہ اس دنیا سے دوسری دنیا کو روانہ ہوگئے —— اب جنازہ شاہین سینما تک پہنچ چکا تھا ۔

اسی شاہین سینما میں کتنی بار ہم لوگوں نے ان کے ہمراہ فلمیں دیکھی تھیں ، فلموں میں جیوگرفی سے متعلق غلطی کو فوراً پکڑ لیتے تھے ۔ ٹی ۔ وی پروگرام «نیلام گھر» میں جغرافیہ سے متعلق غلط جوابات کو صحیح تسلیم کر لیا جاتا تو بہت بر افروختہ ہوتے ۔ آج شاہین سینما پر لگی ہوئی تصاویر اشکبار تھیں ۔ سینما کی دیواریں آہ و بکا کر رہی تھیں ، فضا میں کلمۂ شہادت کی آوازیں گونج رہی تھیں ۔ چوک پر رکھا ہوا ہوائی جہاز ایسے لگتا تھا جیسے گھوم گھوم کر سلامی دے رہا ہو ۔ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس شخص نے اعلیٰ صلاحیتوں والے کتنے ہوا باز پاکستان ایر فورس کو دیئے ہیں جو آج اہم اور کلیدی آسامیوں پر سرفراز ہیں ۔ فصیح صاحب زندہ رہیں گے ان کے ہوا باز انہیں زندہ رکھیں گے ۔ فصیح صاحب کبھی نہیں مر سکتے ، فصیح صاحب امر ہوگئے بقول اقبال :

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں   یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

فصیح صاحب کیسے مر سکتے ہیں؟ ایر فورس کے ہر (base) پر ان کے پائلٹ ان کی عظمت کے عظیم الشان مینار ہیں ۔ ان کے ہاؤس کے دو طلبہ سی ۔ ایس ۔ پی ہیں ۔ شاہد عزیز جو سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں اول آئے اور تسنیم نورانی جنہوں نے تیسری پوزیشن حاصل کی تھی ۔ اب تدفین کا وقت تھا ، فصیح صاحب نفاست پسند انسان تھے ، ان کے جسد خاکی کی تدفین بھی بہت نفاست کے ساتھ ہوئی ۔ لکڑی کے تابوت میں نعش کو رکھا جا رہا تھا ۔ سڑک پر ایک گاڑی رکی ، بلیو بلیزر اور وورسٹڈ کی پتلون میں ایک جنٹلمین لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہم تک پہنچے ۔ یہ نصیر صاحب شعبۂ ریاضی کے سربراہ اور کالج

کے وائس پرنسپل ـــــ میرے اور محبوب صاحب کے پاس آکر رک گئے ، اس سانحہ کی خبر انہیں لاہور میں ملی تھی اب سیدھے لاہور سے آرہے تھے۔ تینوں کی زبانیں خاموش اور گنگ تھیں ۔ نصیر صاحب کی بے زبانی ہم سے پوچھ رہی تھی کہ میری غیر حاضری میں یہ کیا کر دیا ۔ جس طرح وہ ہم سے ہماری خطاؤں کی (Explanation) پوچھا کرتے تھے ، جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ تم لوگوں نے کس طرح سارے فارمولوں کو الٹ پلٹ کر دیا ۔ ہم کیسے بتاتے کہ موت ایک ایسا اصول متعارفہ (Axiom) ہے جسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ۔ میں نے نصیر صاحب کی آنکھوں میں پہلی بار ستارے جھلملاتے دیکھے۔ تابوت بند کرنے سے پیشتر آخری اور بالکل آخری دیدار ، پورا قبرستان سسکیوں سے لرز اٹھا ۔ مردے بھی اپنی قبروں میں رو رہے ہوں گے ، ونگ کمانڈر ریاض نسیم زار و قطار روتے ہوئے آخری دیدار کی ہمت نہ کر سکے ۔ میں نے انہیں سنبھال کر آگے بڑھایا، ہمارے پرنسپل صاحب کفن سرکا کر آخری دیدار کرا رہے تھے ۔

فصیح صاحب کو موت کے بے رحم اور خوفناک پنجوں نے زبردستی یک لخت ہم سے چھین لیا ۔ انسان کس قدر بے بس اور بے اختیار ہے ۔ تابوت کو بند کر دیا گیا گویا یہ فصیح صاحب کی کتاب زندگی کا آخری ورق تھا ۔ احباب نے تابوت کو قبر میں رسیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ نیچے کیا ، رحمان صاحب (ہمارے پرنسپل) ایک کنارہ خود سنبھالے ہوئے تھے ، آہستہ بہت آہستہ ۔ یہ ہی ان کی فطرت کا تقاضا تھا ۔ اس کے بعد تختے فٹ کیے گئے ۔ ایک تختہ صحیح فٹ نہیں ہو رہا تھا ۔ بڑھئی سے فوراً دوسرا تختہ صحیح ناپ کا کٹوایا کہ کہیں اس نفیس انسان کا تابوت گرد آلود نہ ہو جائے، اوپر کی مٹی نیچے نہ گرنے پائے ۔ کسی کی بھاری سی آواز آئی "بس اب ٹھیک ہے!" ۔ مجھے لگا جیسے فصیح صاحب خود کہہ رہے ہیں جس طرح وہ ہر مناسب اور صحیح کام پر کہا کرتے تھے۔

پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں ، فاتحہ خوانی ہوئی اور مجبور و شکست خوردہ قافلہ سب کچھ ہارنے کے بعد، سوگوار اور افسردہ فصیح صاحب کے گھر لوٹ آیا ، اس گھر میں جہاں اب فصیح صاحب کبھی نہیں لوٹیں گے :

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

صدائے ماتم

پائلٹ آفیسر : تعظیم رسول انجم

وہ ایک ہنس مکھ انسان تھا، میں اسے پہلے سے نہیں جانتا تھا ۔ اسے ہی کیا میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا ۔ سرگودھا کی فضا میں ، یہاں کی زندگی میں چند سانس لینے کا ، مجھے پہلی مرتبہ اتفاق ہوا تھا ۔ یہ شہر ، اس شہر کے باسی ، چھوٹے بڑے میرے لیے سب ہی اجنبی تھے اور میں خود بھی تو ایک انجانا مسافر تھا ، جو زندگی کے نا معلوم سفر کے لیے منزلیں مارتا ، یہاں پڑاؤ ڈالے ذرا سستانے لگا تھا ۔ ایسے میں وہ مجھے ملا ، مگر پھر بھی خدا جانے کیوں ؟ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں تو اسے صدیوں سے پہچانتا ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہرگز نا آشنا نہیں ۔ شاید اس کی وجہ میری صدیوں سے محبت ، پیار اور خلوص کی متلاشی اور پیاسی روح تھی ۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ زندہ دل تھا ، یا پھر شاید یہ وجہ ہو کہ اس کی ذات سے محبت کے سوتے پھوٹے پڑتے تھے ۔ ان میں سے کوئی بھی وجہ ہو بہر حال وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھا ۔ ایک ایسی محفل جو بھرپور شباب پر ہو ۔ گو عمر کے لحاظ سے وہ مجھ سے تیس سال کے قریب تو ضرور بڑا ہوگا ۔ مگر پھر بھی کچھ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا مرد آزاد تھا ۔ لڑکے بالوں کے ساتھ ہوتا ، تو محسوس ہوتا کہ وہ تو خود ابھی ایک بہت ہی بھولا بھالا معصوم سا نوجوان ہے ۔ جو اپنی معصومیت کی وجہ سے بچوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ مجھ جیسے جوانوں کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوتی تو سب اس کے گرد ہالا بنا لیتے ۔ گویا وہ چاند تھا اور ہم سب ستارے ، بزرگوں اور اپنے ہم جولیوں کے لیے وہ ایک قابل تقلید انسان تھا ۔ یہ سب کچھ تھا مگر پھر بھی وہ تھا کون ؟ کون تھا وہ ؟ وہ محبت تھا ، وہ پیار تھا ، وہ خلوص تھا ، وہ چمکتا چہرہ ، وہ رونق محفل ، وہ دلوں میں جذبے جگانے والا ، پدرانہ شفقت کا حامل ، برادرانہ عمل کا قائل ، انسانی

اقدار کا مبلغ ، تخیل انسانی کا حسین پیکر ، امن و مساوات کا علمبردار ، زیست کا خوبصورت شاہکار تھا ۔ وہ زندگی تھا ، وہ زندگی کا فلسفہ تھا ، نفسیات انسانی کا پر تو ، روحانی بلندیوں کا منارہ ، جواں ولولوں اور امنگوں کی آواز تھا ۔ دوسرے الفاظ میں وہ زندگی تھا ، زندگی ! وہ زندگی تھا کہ انسانی زندگی کروڑوں سال پر محیط ہے ۔ زندگی کا درس ہے کہ زیست پر جمود طاری نہ ہو ، یکسانیت نہ پیدا ہو ، فطرت انسانی تغیر کی قائل ہے ۔ شعور انسانی نے جب سے ہوش سنبھالا ، تغیر تغیر کی گردان کائنات کے ذرے ذرے سے سنائی دی ۔ زندگی کا فلسفہ ہے کہ اگر زیست پر یکسانیت طاری ہو جائے تو اکتاہٹ جنم لیتی ہے ۔ جب اکتاہٹ ایک بار ظہور پذیر ہو جائے تو پھر اللہ کا خلیفہ ، بجائے خلافت سے حظ اٹھانے کے ، اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے بھرپور لطف اٹھانے کے ، مایوسی اور نامرادی کی تیرہ و تاریک گہرائیوں میں گر جاتا ہے ۔

وہ بنیادی طور پر استاد تھا ۔ مگر ایسا استاد جو سب کچھ سکھاتا ہے مگر کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ استاد ہے ۔ ہاں وہ کچھ ایسا ہی استاد تھا جو ایک لمحے میں بھانپ جاتا ہے کہ کسی شاگرد کے ذہن میں اس وقت کیسا ابال آیا ہوا ہے اور اس سے پیشتر کہ ذہن کا ابال الفاظ کا روپ دھارے سوال بن کر زبان سے ادا ہو وہ خود ہی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا کر ذہن کے تمام شکوک و شبہات دور کر دیتا ہے اور شاگرد کو محو حسرت چھوڑ کر کلاس سے پیریڈ ختم ہونے پر رخصت ہو جاتا ہے ۔ ہاں کچھ ایسا ہی فصیح وہ فصیح استاد تھا ، ہم اس کے شاگرد تھے ، غیر محسوس طور پر ، ذہنی شاگرد ۔ وہ جان محفل تھا ، بنیادی طور پر استاد تھا ، ذہین تھا سمجھ گیا کہ ایک نہ ایک دن چند سال بعد کبھی نہ کبھی وہ جان محفل ، حاضرین محفل میں یکسانیت کی بنیادی وجہ بن سکتا ہے ۔ اکتاہٹ جنم لے سکتی ہے ۔ زیست پر ایک ہی انداز سے جمود طاری ہو سکتا ہے ، اس نے یہاں بھی استادی دکھائی ، اپنی زندگی کا پیریڈ ختم ہونے سے پہلے ہی ہمیں ہکا بکا چھوڑ کر ہمیں زندگی کا فلسفہ سمجھانے سمجھانے ایک نئے جہان کی تلاش میں ایک نئی منزل کی کھوج میں ، کائنات کے سر بستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے ایک انجانے سفر پر روانہ ہوگیا ۔ وہ موت کے بے لگام گھوڑے پر بیٹھا اور آن واحد میں نظروں سے اوجھل

ہوگیا ۔ ہم زندگی کے پیریڈ کے خاتمہ پر صرف ہلتے ہوئے دروازے کو دیکھتے ہی رہ گئے، غالباً وہ ہم سے اکتا گیا تھا ۔ ایک ہی طرح کے صبح و شام گزارتے گزارتے شاید اسے محسوس ہوگیا تھا کہ زندگی پر جمود طاری ہونے کو ہے ۔ نفسیات انسانی کا درس اسے از بر تھا ۔ تغیر تغیر کی گردان ، تبدیلی تبدیلی کی آواز اس کو چین سے نہ رہنے دے سکی اور اس نے فطرت انسانی کی اس آواز پر لبیک کہا ۔ پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجتی ہے تو کہتی ہے کہ اے لوگو سنو کہ پیریڈ مکمل ہوگیا۔ بالکل اسی طرح تو وہ رخصت ہوا اور ہم کو بتا گیا کہ موت بھی زندگی کی تکمیل ہے ۔ یعنی زندگی کا مکمل ہو جانا دراصل موت ہے، اور موت نام ہے ایک دوسرے پیریڈ کے آغاز کا ۔ ایک نئی زندگی کی شروعات کا میں نے اس فصیح استاد کے ساتھ چند لمحے گذارے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی نئی زندگی کے آغاز میں ایک نئے جہان میں وہاں کے باسیوں کے ہالے میں گھرا ہوا انہیں بھی وہ اس زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کر رہا ہوگا ، وہاں بھی وہ جان محفل ہوگا ۔

سید فصیح الدین کی یاد میں

فلائٹ کیڈٹ : محبوب حیدر

بھلانے سے بھی ان کی یاد کے سائے نہیں جاتے
ٹپک پڑتے ہیں آنسو غم میں ٹپکائے نہیں جاتے

گل و بلبل کے نالے ہر طرف ہیں آج فریادی
بھرے گلشن سے مالی یوں نکلوائے نہیں جاتے

ہمارے عالموں کے بھی پسینے ان میں شامل ہیں
چمن خون شہیداں سے ہی مہکائے نہیں جاتے

نکالے جا رہے ہیں عالمان خبر دنیا سے
مشیت کی خدا کے راز سمجھائے نہیں جاتے

ملائک آسماں سے آؤ قبرستان میں جلدی
کہ ہم سے تو فصیح الدین دفنائے جاتے نہیں

میرا باپ

فلائٹ کیڈٹ (انڈر آفیسر) : غلام مجدد

میں نے ان کے ٹھنڈے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور الجھے ہوئے بالوں کو درست کیا ۔ میری نگاہیں خالی اور دل میں ایک غیر یقینی کیفیت تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ زندگی سے اس قدر بھرپور شخصیت ، کشادہ جبین اور روشن آنکھوں والا یہ شخص کیسے موت کی ٹھنڈی اور تاریک وادیوں میں اتر سکتا ہے ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص جس نے ہزاروں لوگوں کو زندگی کا شعور اور سلیقہ بخشا وہ خود زندگی کے بندھنوں کو توڑ کر موت سے اپنا ناطہ جوڑ لے ، میں یہ نہیں مان سکتا ! مجھے لگتا ہے کہ موت ٹھنڈی نہیں ہوتی ، موت تاریک بھی نہیں ہوتی ۔ بلکہ موت پر حرارت اور روشن ہوتی ہوگی ، تبھی تو فصیح صاحب نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا ۔

۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اتوار کا دن تھا جب میں نے پہلی مرتبہ اس شفیق اور مہربان چہرے کو دیکھا اور ۲۱ فروری ۱۹۷۷ء کو سوموار تھا جب میں نے فصیح صاحب کے انتقال کی خبر سنی ۔ اتوار سے لے کر سوموار تک کا یہ عرصہ میری زندگی کے تقریباً سات سالوں پر محیط ہے ۔ پہلی ہی نظر میں مجھے ان کے چہرے سے شرافت اور شفقت کی لہریں پھوٹتی دکھائی دیں ۔ پھر رفتہ رفتہ یہ چہرہ میرے لیے بے بہا پیار ، شفقت اور تقدس کا مظہر بن گیا ۔

میں گلیوں کی زندگی سے نکل کر اس کالج میں آیا تھا ۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی آرزو تھی کہ میں ہوا باز بن کر ملک و ملت کی حفاظت کروں ۔ مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ قوم کی خدمت ایک ایسی ذمہ داری ہے جسے نبھانے کے لیے انسان میں زندگی کا شعور ، کردار کی مضبوطی اور سیرت کا حسن ہونا چاہیے ۔ فصیح صاحب کے فن کار ہاتھوں نے

میری شخصیت کو تراشا ؛ اسے نئے زاویے اور نئی جہتیں عطا کیں ۔ اس کی بنیادوں میں اپنے جگر کا لہو شامل کیا اور اسے اپنی شخصیت کے حسین رنگ بخشے ۔ میں کچھ بھی نہیں تھا مگر انہوں نے مجھے سب کچھ دیا ۔ ایک میں ہی نہیں بلکہ ہزاروں لڑکے ایسے ہیں جنہوں نے اس چشمۂ فیض سے آب حیات حاصل کیا ۔ کتنی ہی ناتراشیدہ شخصیتوں نے اعلیٰ تراش اور بے مثال چمک حاصل کی ۔

فصیح صاحب راست گو ، مہربان اور حساس طبیعت کے مالک تھے ۔ ان کا پیشہ پیغمبری کے زمرے میں آتا ہے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہجوم آبادی میں وہ آسمان سے اتری ہوئی روح دکھائی دیتے تھے ۔ انہوں نے زمین پر آسمانی باتیں سنائیں ، وہ کہتے تھے کہ انسان کا ضمیر کبھی مردہ نہیں ہونا چاہیے ۔ ہر قسم کی منافقت سے انہیں نفرت تھی ۔ وہ اسے ضمیر کی مردہ دلی تصور کرتے تھے ۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ دکھاوے کی عبادت کرنے والے سے وہ شخص ہزار گنا بہتر ہے جو اپنا فرض ایمان داری سے انجام دے اور جس کا ضمیر مطمئن ہو ، اور وہ اپنا فرض کمال ایمان داری سے نبھاتے تھے۔ اپنے پیشے میں انھیں مہارت حاصل تھی ۔ وہ جغرافیہ پڑھاتے تھے ، ان کے پیریڈ کا لطف وہی جان سکتے ہیں جو کبھی ان سے پڑھے ہوں ، مختلف ممالک کے لوگوں ، ان کی بود و باش ، عادات و اطوار ، قدرتی وسائل ، آبشاروں ، دریاؤں ، جھیلوں ، بندرگاہوں اور پہاڑوں کے متعلق یوں باتیں کرتے جیسے وہ سالوں تک وہاں رہے ہوں ۔ وہ الفاظ کی مصوری کچھ ایسے انداز میں کرتے تھے کہ سامعین یوں محسوس کرتے جیسے وہ ان کے ساتھ ان جگہوں کو دیکھ رہے ہوں ۔ ان کے پیریڈ کا ماحول بڑا کشادہ ہوتا تھا ، ہم سب کو اس بات کا یقین تھا کہ فصیح صاحب نے ساری دنیا کی سیاحت کر رکھی ہے ۔ ایک دن ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کن کن ممالک کی سیاحت کی ، تو ان کے چہرے پر مخصوص ملکوتی مسکراہٹ ظاہر ہوئی اور وہ انگریزی میں بولے «میری یہ شدید خواہش ہے کہ میں دوسرے ممالک کی سیر کروں» اور تمام لوگ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگے ۔

فصیح صاحب ایک ماہر نباض تھے ۔ ان کی آنکھیں ایک ہی لمحے میں لڑکے کے کردار اور اطوار کو پرکھ لیتی تھیں ۔ نظم و ضبط کے معاملے میں وہ کسی کو ڈھیل نہیں

دیتے تھے ۔ اگر وہ کسی سے ناراض بھی ہوتے ، تو ان کا غصہ کبھی چہرے سے نیچے نہیں اترتا تھا ۔ میں نے ہمیشہ ان کے دل میں دوسروں کے لیے بے پناہ پیار اور شفقت ہی دیکھی ہے ۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ رات گئے کوئی کیڈٹ اچانک بیمار پڑ گیا تو فوراً اسے اپنی کار میں ہسپتال چھوڑ کر آتے تھے ۔ سکواڈرن میں اگر کوئی کیڈٹ بیمار ہوتا تو اسے اپنے ہاں سے دودھ اور دوسری چیزیں بھجواتے تھے ۔ انھیں یہ احساس تھا کہ وہ قوم کے مستقبل کی نگہبانی کر رہے ہیں ۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کو وہ اپنی سب سے بڑی عبادت اور نیکی سمجھتے تھے ۔ ان کا ہر لمحہ کیڈٹوں کی بہتری کے لیے گزرتا ۔ جس سے بھی وہ جیسا برتاؤ کرتے وہ اس کے لیے چاہے کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو ، مگر اس میں ہمیشہ اس کی سلامتی اور بہتری ہوتی تھی ۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو اسے اس کے برے نتائج سے آگاہ کرتے اور آئندہ محتاط رہنے کی تلقین کرتے تھے ۔

فصیح صاحب حساس ترین دل کے آدمی تھے ۔ ذرا سی بات کو وہ اپنے دل پہ لگا لیتے تھے ۔ مگر اس کو اس طرح چھپا لیتے کہ دوسروں کو اس کا پتا نہیں چلتا تھا اور احساس کا سارا درد وہ خود ہی سہہ لیتے ۔ منیر سکواڈرن کے انڈر آفیسر ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کتنا سوچتے تھے ۔ سکواڈرن کے ہر کیڈٹ کے بارے میں ان کی معلومات مکمل ، رائے ہمیشہ درست اور ماہرانہ ہوتی تھی ۔ یہ بات ان کے وسیع تجربے اور اپنے پیشے کے متعلق ان کے خلوص اور لگن کو ظاہر کرتی ہے ۔

فصیح صاحب کو جغرافیہ ، کرکٹ اور منیر سکواڈرن سے بہت پیار تھا ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت کرکٹ کھیلا ، اس کھیل سے انھیں عشق تھا ۔ وہ جغرافیہ اور کرکٹ پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ، ان کا علم ان دونوں چیزوں کے بارے میں بہت وسیع تھا ۔ جو کیڈٹ کرکٹ یا جغرافیہ میں اچھے ہوتے وہ انھیں بہت پسند کرتے تھے ۔ منیر سکواڈرن تو ان کی متاع حیات تھا ، انھوں نے اس کالج کو اور خصوصاً منیر سکواڈرن کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے ۔ وہ ہر گھڑی اور ہر لمحہ سکواڈرن کے بارے میں سوچتے تھے ۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں سے لے کر ، ہر کیڈٹ کی ذاتی الجھنوں تک وہ اپنی توجہ صرف کرتے تھے ۔ ہمارے سکواڈرن کا منفرد پاکیزہ ماحول اور ایسی فضا جس میں اپنائیت

اور ذہنی کشادگی کا تأثر ہے ۔ سب ان کی وجہ سے قائم ہے ۔ اب میں اپنے سکواڈرن کو دیکھتا ہوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان در و دیوار میں پہلے والی شوخی اور وارفتگی نہیں رہی تو ناصر کاظمی کا یہ شعر بے اختیار میری زبان پر آ جاتا ہے :

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

وہ انسانیت کا پیکر اور نفاست کا مجسمہ تھے ۔ ان کی سوچ ، انداز تکلم ، برتاؤ اور روزمرہ کے معمولات میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا ۔ وہ ایک متمدن انسان تھے اور تہذیب و شرافت کے زبردست داعی تھے ۔ چھوہڑ پن سے انہیں شدید چڑ تھی اور کردار کا ٹیڑھا پن انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا ۔ انتخاب چاہے دوستوں کا ہو یا لکھتے وقت الفاظ کا ، وہ بڑے محتاط اور نفیس واقع ہوئے تھے ۔ باتمیز اور با اخلاق لڑکے انہیں بہت بھاتے تھے ۔ کسی میں کوئی خوبی دیکھ لیتے تو جی بھر کے اس کی تعریف کرتے تھے ۔ ایسے میں وہ ایک ایسے فن کار دکھائی دیتے جو اپنے ہی شاہکار کے سحر میں گرفتار ہو گیا ہو ۔

میرے ذہن میں ہر وقت ان کی روشن صورت پھرتی رہتی ہے ۔ میں نے انہیں ہزار زاویوں سے دیکھا ہے اور میری سوچوں میں وہ اپنی تمام تر رعنائیوں شفقتوں اور مسکراہٹوں کے ساتھ آتے ہیں ۔ ان کی متحرک اور فعال شخصیت کا تصور ہی اتنا زندگی بخش ہے کہ مجھے ان کی موت پر شک ہونے لگتا ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان پر موت بھی آکر زندگی بن گئی ہو ۔

کہتے ہیں کہ فن کار کو اس کا فن دوام بخشتا ہے ۔ لہذا ایک عظیم فن کار زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے ۔ فصیح صاحب ایک سچے فن کار تھے ، ان کے شاہکار ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں ہیں اور وہ رہتی دنیا تک اپنے شاہکاروں کے روپ میں زندہ رہیں گے ۔ میں سکندر اعظم جتنا بڑا آدمی تو بالکل نہیں ہوں ۔ مگر میں بھی وہی کہتا ہوں جو سکندر اپنے استاد ارسطو کے بارے میں کہا کرتا تھا ۔ «میرا حقیقی باپ مجھے آسمانوں سے زمین پر لایا اور میرے روحانی باپ نے مجھے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا» ۔

فضائیہ کا ہر ایک افسر

فلائٹ کیڈٹ : **باور عباس**

ہماری ملت کا ترجماں ہے ہماری ہمت کا اک نشاں ہے
ہماری عزت کا پاسباں ہے ہمارا دل ہے ہماری جاں ہے
فضائیہ کا ہر ایک افسر

قوی ارادے ہیں جس کا محور ہر اک بلندی ہے جس سے کم تر
نگہ درخشاں جبیں منور وہ شیر دل حوصلوں کا پیکر
فضائیہ کا ہر ایک افسر

محافظ سرحد وطن ہے اسی سے تابانیٔ چمن ہے
جوان ہمت جواں لگن ہے بلند پرواز میں مگن ہے
فضائیہ کا ہر ایک افسر

کمال فن اس پہ آشکارہ جری دلاور قوی سہارا
شباب بجلی نظر شرارہ ہمارا سورج ہمارا تارا
فضائیہ کا ہر ایک افسر

تمام تر وسعتیں مسخر تمام تر عظمتیں نچھاور
تمام رعنائیوں کا مصدر ہمارا کیڈٹ ہمارا باور
فضائیہ کا ہر ایک افسر
فضائیہ کا ہر ایک افسر

غزل

فلائٹ کیڈٹ : ظہیر حسن شیرازی

تھی سرد شام خزاں پر سماں سہانا تھا
کہ ساتھ میرے جب اک دوست بھی پرانا تھا

کسے گماں تھا کہ جو شخص ہم پہ مرتا ہے
اسی کو خون کے آنسو ہمیں رلانا تھا

برہنہ پیڑوں میں بیٹھا ہوں صبح سے حیراں
وہ کیسے ٹوٹا جو رشتہ بڑا پرانا تھا

میں اپنے آپ سے بچھڑا نگر نگر گھوموں
تھا ایک وقت کہ میرا سبھی زمانہ تھا

عجب سکوت تھا چیخیں بھی دب گئیں جس میں
وگرنہ چاہا تو ہم نے تمہیں بلانا تھا

کسی نے جھانکا نہ اپنی فصیل سے باہر
بہت جہاں تھے آگے وسیع زمانہ تھا

ہر ایک زہر کا تریاق لے کے آئے دوست
مگر میں مر گیا انسان کا نشانہ تھا

تمہارے ذوق سماعت پہ ہے گراں ورنہ
محیط صدیوں پہ قصہ تمہیں سنانا تھا

یہ کیا سحر تھا کہ ہر چشم شہر تھی پرنم
دہن ہزار تھے شیرازی ، اک افسانہ تھا

ہوئی ہو ۔ کیونکہ یہ نسل جب پروان چڑھے گی تو اپنے نصب العین کو دیکھے گی اور پھر یہ دیکھے گی کہ اس پر کس قدر عمل ہوا ہے ۔ جب وہ تضاد محسوس کرے گی تو پھر ان میں ہیجان پیدا ہوگا اور نوجوان اٹھ کھڑے ہوں گے اور نظام کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ لہذا آج جو بے چینی نئی نسل میں پائی جاتی ہے وہ باعث تشویش نہیں بلکہ باعث ستائش ہے ۔ ایک نوجوان جب دیکھتا ہے وہ اپنے نصب العین سے کس قدر ہٹ چکا ہے تو وہ ان حالات و واقعات کو تلاش کرتا ہے جن کے باعث یہ ہوا اور پھر انہیں بدلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ انہیں مثبت انداز میں ہی بدلے ۔ سمت کا تعین اس کی تربیت کرتی ہے ۔ غلط تربیت اسے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے پر مجبور کر سکتی ہے تو صحیح تربیت اسے ملک کو اپنے نصب العین کے مطابق ڈھالنے میں ممد ثابت ہوتی ہے ۔

کسی ذی ہوش آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی چیز کے حصول کے لیے دل جمعی سے کام کرے گا جب تک اسے اپنے مقصد پر فخر نہ ہو ۔ ہٹلر نے جرمنوں کو صرف یہی احساس دلایا تھا کہ وہ دنیا کی بہترین قوم ہیں اور صرف انہیں ہی حکومت کرنے کا حق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے تباہ حال جرمنی کو جسے صرف پانچ لاکھ فوج رکھنے کی اجازت تھی جسے فضائیہ سے محروم کر دیا گیا تھا ، وہ ایک قلیل عرصہ میں ایک نئی جنگ کے لیے تیار کرنے میں کامیاب ہوا تھا ۔ یہاں میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہٹلر کی تربیت آئیڈیل تھی ۔ گو اس کی تمام تر کوششیں اور قوتیں ایک منفی مقصد کے حصول کے لیے وقف تھیں مگر پھر بھی اس کا تجربہ کامیاب رہا کہ اپنے مقصد پر فخر کرنے والے اس کے حصول کی خاطر دل جمعی سے کام کر سکتے ہیں ۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو ایسی تربیت ملے کہ وہ اپنے نصب العین پر فخر کرنے لگے ۔ ہمارا نصب العین جس کی خاطر ہم نے آزادی حاصل کی تھی ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل تھا ۔ آج کے نوجوانوں کا گمراہ ہو جانا متوقع امر ہے ۔ کیونکہ نیشنلزم اور سوشلزم جیسے پر فریب رستے اس کے لیے کھلے ہیں ۔ لہذا اولین ضرورت آج نوجوان میں قوم کے تصور کو اجاگر کرنے کی ہے ۔

ہوئی ہو ۔ کیونکہ یہ نسل جب پروان چڑھے گی تو اپنے نصب العین کو دیکھے گی اور پھر یہ دیکھے گی کہ اس پر کس قدر عمل ہوا ہے ۔ جب وہ تضاد محسوس کرے گی تو پھر ان میں ہیجان پیدا ہوگا اور نوجوان اٹھ کھڑے ہوں گے اور نظام کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا آج جو بے چینی نئی نسل میں پائی جاتی ہے وہ باعث تشویش نہیں بلکہ باعث ستائش ہے ۔ ایک نوجوان جب دیکھتا ہے وہ اپنے نصب العین سے کس قدر ہٹ چکا ہے تو وہ ان حالات و واقعات کو تلاش کرتا ہے جن کے باعث یہ ہوا اور پھر انہیں بدلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ انہیں مثبت انداز میں ہی بدلے ۔ سمت کا تعین اس کی تربیت کرتی ہے ۔ غلط تربیت اسے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے پر مجبور کر سکتی ہے تو صحیح تربیت اسے ملک کو اپنے نصب العین کے مطابق ڈھالنے میں ممد ثابت ہوتی ہے ۔

کسی ذی ہوش آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی چیز کے حصول کے لیے دل جمعی سے کام کرے گا جب تک اسے اپنے مقصد پر فخر نہ ہو ۔ ہٹلر نے جرمنوں کو صرف یہی احساس دلایا تھا کہ وہ دنیا کی بہترین قوم ہیں اور صرف انہیں ہی حکومت کرنے کا حق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے تباہ حال جرمنی کو جسے صرف پانچ لاکھ فوج رکھنے کی اجازت تھی جسے فضائیہ سے محروم کر دیا گیا تھا ، وہ ایک قلیل عرصہ میں ایک نئی جنگ کے لیے تیار کرنے میں کامیاب ہوا تھا ۔ یہاں میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہٹلر کی تربیت آئیڈیل تھی ۔ گو اس کی تمام تر کوششیں اور قوتیں ایک منفی مقصد کے حصول کے لیے وقف تھیں مگر پھر بھی اس کا تجربہ کامیاب رہا کہ اپنے مقصد پر فخر کرنے والے اس کے حصول کی خاطر دل جمعی سے کام کر سکتے ہیں ۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو ایسی تربیت ملے کہ وہ اپنے نصب العین پر فخر کرنے لگے ۔ ہمارا نصب العین جس کی خاطر ہم نے آزادی حاصل کی تھی ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل تھا ۔ آج کے نوجوانوں کا گمراہ ہو جانا متوقع امر ہے ۔ کیونکہ نیشنلزم اور سوشلزم جیسے پر فریب رستے اس کے لیے کھلے ہیں ۔ لہٰذا اولین ضرورت آج نوجوان میں قوم کے تصور کو اجاگر کرنے کی ہے ۔

قومیت کے اس مسئلے پر ماضی میں بہت لے دے ہوئی۔ آج کے دور میں اقوام کی تشکیل کی بنیادیں اشتراک نسل، اشتراک زبان، اشتراک رنگ اور معاشرتی اغراض کا اشتراک ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اس نہج پر بننے والی اقوام کس حد تک کامیاب رہی ہیں۔ دراصل اوپر بیان کردہ بنیادوں پر تشکیل پانے والی اقوام خود کو محدود کر لیتی ہیں۔ وہ اپنے گرد حصار کھینچ لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئن شٹائن صرف یہودی ہونے کی وجہ سے جرمنی سے نکال دیا گیا۔ بنگالی اور بہاری ۱۴ سال میں بھی ایک قوم نہ بن سکے، ریوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں ہر جگہ «صرف کالوں کے لیے» یا صرف «گوروں کے لیے» کے بورڈ آویزاں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس نظریات کی بنیاد پر بننے والی اقوام جہانی بن جاتی ہیں۔ یہ مشترک نظریات کی ہی بات ہے کہ یہودی دنیا بھر میں پھیلے ہونے کے باوجود ایک قوم رہے اور انہوں نے اپنے لیے الگ وطن حاصل کر لیا۔ ہم نے بھی مشترک نظریات کے باعث ہی اپنے سے کئی گنا بڑی طاقتوں کا مقابلہ کر کے پاکستان حاصل کیا۔

آئیے یہ دیکھیں کہ آج کے دور میں قومیں کن نظریات پر بنتی ہیں اور پھر ان نظریات کا موازنہ اس نظریے سے کریں جس کی بنیاد پر ہماری قوم کی تشکیل ہوئی ہے۔

بیسویں صدی میں کئی قسم کے نئے نظریات اور ضابطوں نے جنم لیا۔ قدیم روم کے نظریے پر چل کر مغرب والے نیشنلزم کے تصور تک پہنچے۔ یہ تصور ارسطو کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ ارسطو اپنی کتاب «السیاست» میں لکھتا ہے کہ وحشی قوموں کو صرف غلامی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور مہذب قوموں کو چاہیے کہ وہ انہیں غلام بنانے کی جد و جہد کریں۔ اس کے نزدیک مہذب قوم صرف اس کی اپنی قوم تھی۔

ایک نظریہ کارل مارکس نے پیش کیا۔ یہ معاشی مساوات کا نظریہ تھا۔ جو جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کے فلسفہ کی بنیاد پر تھا جس کے مطابق ہر چیز کا مثبت اور منفی رد عمل ہوتا ہے اور پھر ان دونوں کے ملنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہی رائے عامہ قبول کرتی ہے۔ مارکس کے فارمولے میں معاشی مسائل کا حل تو بہت اچھا دیا گیا ہے مگر مارکس روحانیت سے انکار کر بیٹھا۔ اس نے اپنے فلسفے کی بنیاد لا الٰہ کو بنایا اور خدا کے وجود سے منکر ہو گیا۔ اقبال اس کے معاشی نظریات سے بہت متاثر ہوئے تھے اور

انہوں نے کہا تھا کہ روس والوں کا معاشی نظام اچھا ہے ۔ مگر اس کی ترویج کے لیے انہیں «لا الہ» سے «الا اللہ» کی طرف جانا پڑے گا ۔

تیسرا نظریہ ہٹلر کا نازی نظریہ تھا جو دراصل نطشے کے «سپر مین» کے تصور پر قائم ہوا تھا ۔ اس میں نیشنلزم کا افتخار اپنی آخری حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے مگر مادی وسائل کے حصول کے لیے اس نظریے میں نفرت و حقارت کو بنیاد بنایا گیا ہے ۔ نازی پارٹی کے نظریات کو اپنا منشور بنایا ۔ ہٹلر کے مشہور مشیر ہاشوفر کے نظریات یہ تھے :

(الف) عسکری وجوہات کے باعث ایک ملک کو معاشی طور پر خود کفیل ہونا چاہیے ۔

(ب) جرمنی ایک متحرک مملکت ہے جس کا مقصد اپنی اعلیٰ نسل کی برتری کا حصول ہے جو دنیا پر غالب آ کر امن اور اعلیٰ تہذیب قائم کرے گی ، لہٰذا جرمنی ہی کو رہنے کا حق ہے اور دیگر اقوام کو چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت کریں ۔

(ج) تمام علاقے جو زبان ، نسل یا معاشی مفادات کے باعث جرمنی سے کوئی تعلق رکھتے ہیں انہیں جرمنی کے زیر تسلط لایا جائے ۔

(د) حدود ایک عارضی چیز ہیں جنہیں جرمنی کے مفاد کی خاطر بدلتے رہنا چاہیے۔

جب یہ نظریات ارتقاء پذیر تھے اس وقت برصغیر میں آزادی کے لیے بے چینی پیدا ہو رہی تھی ۔ اس وقت کے مدبر ان تمام نظریات کا مطالعہ کر رہے تھے ۔ علامہ اقبال کی عمر کے آخری سال قوم اور ملت کی بحث میں گزرے ۔ انہوں نے صدر دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ «متحدہ قومیت» کی آخر وقت تک مخالفت کی ۔ اس وقت کے ابھرتے ہوئے نظریات کا مطالعہ کرنے اور انہیں پرکھنے کے بعد اکابرین وقت نے یہ محسوس کیا کہ وہ سب اسلام سے کم تر ہیں ۔ اسلام ان تمام نظریات کے اچھے پہلو سموئے ہوئے ہے اور تمام برے پہلوؤں سے دامن بچائے ہوئے ہے ۔ اسلام معاشی برابری کا قائل ہے ۔ ملت پر فخر کا تصور بھی اسلام میں موجود ہے ۔ مسلمان «خیر الامت» ہیں مگر اس کے افتخار

کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسروں کے حقوق میں مداخلت ہوتی ہے۔ اسلام نے عصبیت کی مذمت کی ہے۔ حضور نے فرمایا:

«لیس منا من علی العصبیة، لیس منا من دعی الی العصبیة، لیس منا من قاتل للعصبیة» . (حدیث)

«جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے» ۔

«یا ایها الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوباً وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله اتقاکم . (الحجرات)

«اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ آپس میں پہچانے جاؤ۔ درحقیقت معزز تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے» ۔

اسلام نسل اور رنگ پر فخر کرنا نہیں سکھاتا۔ بلکہ اس کی مذمت کرتا ہے۔ حضور نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا:

«لا فضل لعربی علی اعجمی ولا لأعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی» .

«کسی عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر فضیلت نہیں ہے۔ اگر فضیلت ہے تو صرف پرہیزگاری کی بنا پر» ۔

اگر ہم اس تقسیم کو چھوڑ کر اپنے گرد رنگ و نسل کا حصار قائم کر لیں تو پھر کوئی شخص دوسرے رنگ یا نسل کے آدمی کو اپنا ہیرو قرار نہیں دے گا جب کہ اسلام میں حاکم کا معیار صرف یہ ہے: «چاہے تمہارے اوپر حبشی غلام ہی امیر کیوں نہ بنا دیا

جانے جس کا رنگ کشمش کا سا ہو پس تمہیں چاہیے کہ اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو جب تک وہ تمہیں کتاب اللہ کے مطابق چلائے۔ اسلام کی رو سے دنیا میں صرف دو گروہ ہیں «حزب اللہ» اور «حزب شیطان»۔ ہمیں خون کے رشتوں کو بھی بھول جانے کا حکم ہے۔ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو محبوب رکھیں مگر اس کا مطلب تنگ نظری ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر کفر سے توبہ کرے تو وہ دینی بھائی بن جاتا ہے۔

اس لحاظ سے ہماری قومیت دوسروں سے جدا ہے جیسے اقبال فرماتے ہیں :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو آزاد ملک کی ضرورت نہیں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس پر عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کے ہاتھ میں اتھارٹی نہ ہو۔ لہذا مسلمان حکومت کے قیام کو اسلامی نظام حیات کی ترویج میں بنیادی دخل حاصل ہے۔ اسلامی کیلنڈر نہ تو رسول اللہ کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور نہ ان کی وفات سے اور نہ ہی ان کی نبوت کے سال سے۔ بلکہ اس وقت سے جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اس جگہ کو «دارالاسلام» کہا جاتا ہے جہاں حکومت غیر مسلم کی ہو وہ جگہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب» ہے۔ دارالحرب کے متعلق اسلام کا نظریہ ہے :

(الف) آزادی کے لیے جدوجہد کرو۔

(ب) اگر جدوجہد ممکن نہ ہو تو کسی ہمسایہ ملک میں ہجرت کر جاؤ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور حکومت ہو۔

(ج) اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو شادی نہ کرو اور اس طرح اپنی نسل کو خود ختم کر دو تاکہ مسلمان زیادہ عرصہ غلام نہ رہیں ۔

اس تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام نے فراخ دلی ، تحمل اور در گزر کا سبق دیا ہے ۔ کسی پر حملہ کرنے میں پہل کی ممانعت کی ہے ۔ جنگ کی صورت میں بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ اٹھانے سے منع کیا گیا ہے ۔ فصلوں کی حفاظت کے لیے کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ اگر مخالف فریق صلح پر آمادہ ہو جائے تو تم بھی صلح کر لو اور جب تک وہ اپنا عہد نبھائے جائیں، تم بھی ایسا کرو ۔

تاریخ شاہد ہے کہ دور جاہلیت کے حکمرانوں کے علاوہ نام نہاد روشن خیال دنیا کے حکمرانوں نے ذاتی خواہشات کی تکمیل کی خاطر بنی نوع انسان کا خون بکثرت بہایا ۔ اس کے بر عکس اسلام کی مثال بھی دیکھ لیجیے ۔ حضرت امام حسینؓ اپنے قافلے کے ہمراہ جب کربلا پہنچے تو دشمن کی فوج نے گھیرے میں لے لیا ۔ دریا کے پانی پر پہرے بٹھا دیے ۔ وقت جوں جوں گزرتا گیا جنگ ناگزیر ہوتی گئی ۔ آپ نے ایک رات اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے فرمایا : یزید کو اگر کوئی تعرض ہے تو مجھ سے ہے اور کسی سے نہیں ۔ تم خوامخواہ خود کو مصیبت میں مت ڈالو ۔ اگر کوئی میرا ساتھ چھوڑنا چاہے تو وہ بخوشی ایسا کر سکتا ہے ۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہ ہوگا ۔ مگر جب کوئی نہ گیا تو آپ نے چراغ گل کر دیا اور فرمایا کہ اگر کوئی آنکھوں کی شرم کی وجہ سے نہیں جا سکا تو اب چلا جائے ۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں حصول اقتدار کے لیے لوگوں نے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کیے ۔ مگر اسلام میں اقتدار کا تصور کچھ اور ہی ہے ۔ اور وہ تصور «سید القوم خادمہم» کا ہے ۔ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ اقتدار کے لیے کوئی کوشش نہیں کیا کرتا تھا بلکہ قوم جسے اہل سمجھتی تھی ذمہ داری سونپ دیا کرتی تھی اور امیر منتخب ہونے والا خوشی کے شادیانے نہیں بجایا کرتا تھا بلکہ احساس ذمہ داری اس کی آنکھوں کو نم کر دیا کرتا تھا ۔ عام آدمی کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ وہ بھرے جلسوں میں خلیفہ کو ٹوک دیتا تھا۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی مملکت بنانے میں نئی نسل موثر کردار ادا کرے گی ۔ کیونکہ آج کی نوجوان نسل میں ایک بے قراری پائی جاتی ہے آج کے جوان طالب علم میں اتنی جرات پیدا ہو گئی ہے کہ وہ مغربی ممالک کے لوگوں کی بلند اخلاق کی مثالیں دینے والے استاد کو سر عام ٹوک دیتا ہے اور اسے کہتا ہے اسلام کی تاریخ اس سے بہتر مثالیں پیش کرتی ہے ۔ آج کا نوجوان اسلام کی سچائی کا قائل نظر آتا ہے اس کے دل میں اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے ۔ مگر وہ انفرادی طور پر اسے اپنانے سے معذور ہے کیونکہ اسلام تو پورے معاشرے کے لیے ضابطہ حیات ہے ۔ آج مجھے امید کی کرن نظر آ رہی ہے کہ جب آج کا طالب علم کل پارلیمنٹ میں جائے گا اور حکومت کی عنان سنبھالے گا تو اس کو اسلامی مملکت بنانے کی بھر پور کوشش کرے گا ۔

اسلام آج بھی اسی طرح قابل عمل ہے جس طرح آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے تھا ۔ آج میں پاکستانی قومیت کے تصور کو اس طرح بیان کروں گا ۔

«پاکستان ایک متحرک مملکت ہے جس کی سرحدیں دنیا کے ہر اس خطے تک ہیں جہاں ایک بھی مسلمان بستا ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مملکت پاکستان ان تمام علاقوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے» ۔

غزل

عالم علیگ

(۱)

اک لمحے کو دیکھا کہ وہ دلدار کھڑا تھا
پھر آنکھ جو جھپکی تو سر دار کھڑا تھا

تپتے ہوئے سورج پہ نگاہوں کو جمائے
میں منتظر سایہ دیوار کھڑا تھا

اک بار نظر آئی تھی وہ شوق کی محمل
پھر راہ میں جوں نرگس بیمار کھڑا تھا

پوشیدہ تھی وہ جنس نہاں خانہ دل میں
بازار میں ہر شخص خریدار کھڑا تھا

اک عمر سے زنجیر پہن رکھی تھی جس نے
وہ شخص بھی آمادہ پیکار کھڑا تھا

خود موت ہی آئی نہ مجھے لینے کو عالم
میں دیر سے دہلیز پہ تیار کھڑا تھا

★

چھپائے پھرتا نہ ہو دشنہ آستینوں میں
کوئی تو ایسا ملے شہر کے مکینوں میں

وہ رہنے والا تو پتھر کے دیس کا نکلا
تلاش کرتا رہا جس کو آبگینوں میں

اندھیری رات میں جو میرے پاس آیا تھا
وہ راہ بھول گیا روشنی کے زینوں میں

برنگ قوس قزح آسمان پہ پھیل گیا
وہ حرف راز جو تھا روح کے دفینوں میں

ہر ایک شخص مصر ہے یہاں پہ کیا کیجیے
ہمیں شمار کرو شہر کے حسینوں میں

تم اعتبار محبت کے ہو قتیل عالم
وہ بات کہہ کے بدلتا گیا قرینوں میں

لافانی ادب

فلائٹ کیڈٹ شیخ فرجاد الرحمن

اس نے سوچا :

اس ملک کے عوام اس کی تحریروں سے محروم رہ جائیں گے تو ان کی بدنصیبی کی انتہا ہوگی ۔

اس نے اپنا ایک مضمون ملک کے ایک مشہور جریدے کو بھیجا ۔

تین ماہ گزر گئے ۔

اس نے ایڈیٹر کو یاد دھانی کے لیے خط لکھا ۔

چار ماہ اور گزر گئے ۔

اس نے اپنا مضمون ایک اور جریدے کو بھیجا اور ساتھ ہی واپسی کا ٹکٹ بھی ۔

اور پانچ ماہ تک اور انتظار کیا ۔

اس کا مضمون واپس آ گیا اور ساتھ ہی ایڈیٹر کا یہ نوٹ بھی :

"براہ کرم کاغذ کے ایک طرف لکھیے" ۔

اس نے کاغذ کے ایک طرف لکھ کر بھیجا ۔

چھ ماہ اور گزر گئے ۔

تنگ آ کر وہ اپنا مجموعہ مضامین ایک پبلشر کے پاس لے گیا ۔

پبلشر نے مسودہ ایک چپڑاسی کو دیا ۔

چپڑاسی نے مسودہ سونگھا اور بولا : "نہیں" ۔

وہ ایک اور پبلشر کے پاس گیا ۔

وہ بڑا شریف آدمی تھا۔ بولا :

«برخوردار جاسوسی ناول لکھو تو چھپ سکتا ہے ، یہ بھلا کون پڑھے گا» ؟

وہ ایک اور پبلشر کے پاس گیا۔

اس نے مسودہ لے لیا۔

اگلے روز وہ اس کے پاس گیا۔

پبلشر بولا :

«بھئی اس کو میرے بچوں نے ناپسند کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ مخرب الاخلاق ہے»۔

پبلشر کے بچوں کی عمریں ، علی الترتیب دس سال ، پانچ سال ، تین سال اور دو ماہ تھیں۔

ایک نیک دل پبلشر اس شرط پر رضا مند ہو گیا کہ سب خرچ اسے برداشت کرنا ہوگا اور کتاب پر پبلشر کا نام نہیں ہوگا ورنہ اس کی ساکھ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

کتاب شروع ہو گئی اور چھپ بھی گئی۔

تمام جلدیں اٹھائے وہ ایک کتب فروش کے پاس گیا۔

وہ بڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس شرط پر راضی ہو گیا کہ ستر فی صدی کمشن لے گا، اور کتاب بکے گی تب ہی قیمت ملے گی۔

اگلے دکان دار کے پاس گیا۔

اس نے پچھتر فی صد کمیشن مانگا۔

اس سے اگلے نے مشفقانہ مشورہ دیا کہ ان باتوں پر وقت ضائع نہ کرے اور اگر لکھنے کا شوق ہے تو اسلامی یا جاسوسی ناول لکھے . . . .

رومانی ناول بھی چل سکتے ہیں . . . .

بشرطیکہ وہ جذبات آمیز و سرور انگیز ہوں۔

چلتے چلتے وہ شہر کے آخری کونے تک جا پہنچا۔

رات ہو چکی تھی -
اور ابھی تک صرف دو کتابیں بکی تھیں -
ایک تو کباڑیئے نے ترس کھا کر خرید لی -
اور دوسری ایک خوانچے والے نے ، جس کے پاس ردی کاغذ ختم ہو چکا تھا -
اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھیں -
چاند اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ چمک رہا تھا -
اور اس کا عکس دریا کی لہروں میں ہلکورے لے رہا تھا -
تارے نکلے ہوئے تھے -
دریا کا پل سنسان تھا -
دور کہیں سے بنسری کی پر سوز آواز آ رہی تھی -
اس کے خیالات عجیب وادیوں میں محو پرواز تھے -
اس نے کتابوں کے بنڈل کو پیار سے سہلایا -
اور پھر کچھ سوچ کر !
اس نے کتابوں کا بنڈل ایک رسے کی مدد سے اپنی کمر سے باندھا -
اور دریا میں کود گیا -
تھوڑے عرصے بعد ....
لوگوں نے ایک کباڑیئے کے پاس اس کی لکھی ہوئی کتاب دیکھی -
ایک غلغلہ مچ گیا . . . لافانی ادب !
لا فانی ادب . . . ہر ایک کی زبان پر یہی تھا -
اس کی یاد میں رسالے نکالے گئے -
اور ایڈیٹروں نے وہ خطوط بڑی آب و تاب سے شائع کیے جو وہ انہیں اپنے مضمون کی یاد دہانی کے لیے لکھا کرتا تھا -

کی برائیوں اور ذلت و پستی کا تجزیہ کر کے انہیں انفرادیت برقرار رکھنے اور اپنی شاندار اسلامی روایات کو قائم رکھنے کا مشورہ دیا ۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی زبوں حالی کا تجزیہ کیا بلکہ حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کے لیے لائحۂ عمل بھی مرتب کیا ۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اخوت ، مساوات ، یقین محکم ، عمل پیہم اور انسانیت سے محبت کا درس دیا ۔ انھوں نے مغربی فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا اور اسلام کو ایک درخشاں سورج کی طرح بہترین نظام پایا ۔ لادینیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے "لا" سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ "الا"

۹۔ اقبال اور قرآن

کلام اقبال قرآن سے ماخوذ ہے ۔ وہ قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین کے ساتھ تفسیر لکھتے ہیں ۔ اسلام محض اس لیے ان کا مذہب نہیں کہ وہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے بلکہ وہ مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال کر معجزات قرآن پر صدق و یقین کے حامل ہوئے ۔ عظمت قرآن کا احساس ان کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے ۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جابجا قرآنی آیات کے حوالے استعمال کیے ۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمات قرآنی سے دوری پر خون کے آنسو روتے تھے اور امت مرحومہ کی توجہ علم و حکمت قرآن کی طرف مبذول کرانا چاہتے تھے ، اور جا بجا طنزیہ لہجہ بھی اختیار کر لیتے تھے مثلاً

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس قدر فقیہان حرم بے توفیق

۷۔ اقبال کا فلسفۂ خودی

علامہ اقبال نے وقت کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے قوم کی ذہنی بیماریوں کے پیش نظر فلسفۂ خودی ، عزت نفس ، غیرت ، خود اعتمادی اور خود داری کا نظریہ بطور پیغام پیش کیا تاکہ قوم میں تبدیلی اور انقلاب آ سکے ۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

وہ اس خودی کے پیامبر نہیں جس سے ابلیس کے غرور ، تکبر اور خود سری کی بو آتی ہو بلکہ وہ اس خودی کا درس دیتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی خودی ہے

حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی بحث و تکرار بھی ہو جاتی تھی - ایک کھلاڑی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ اس کی نماز جنازہ کھیل کے میدان میں پڑھائی جائے - فٹ بال فیلڈ پرنم آنکھوں اور روتے ہوئے دلوں سے پر تھا - نماز ہو چکی تھی اب احباب اور طلبہ میت کو لے کر پی - اے - ایف قبرستان کی طرف روانہ ہوئے - ان ہی راہوں سے فصیح صاحب کتنی بار گزرے تھے، پیدل، سائیکل پر، کار میں۔۔۔کار چلانے کا بہت شوق تھا کہا کرتے تھے: "I love driving" - کار خریدنے پر بیگم سے خاصی تکرار ہوئی بیگم کا کہنا تھا پہلے مکان بناؤ، فصیح صاحب مجھ سے کہنے لگے «لو بھلا بتاؤ بوڑھے ہوکر کار چلانے میں کیا لطف ہوگا، مکان بناتے بناتے تو انسان بوڑھا ہو جاتا ہے» - پہلے انہوں نے فیئٹ 500 خریدی تھی ہم انہیں چھیڑنے کو ان کی گاڑی کو صابن دانی کہتے تھے - فصیح صاحب کو چھیڑنے میں خاص لطف آتا تھا، انٹر ہاؤس فٹ بال مقابلوں میں ان کا اور ہمارا ہاؤس فٹ بال میچ کھیل رہا تھا - میں اپنی بیگم کے ہمراہ بیٹھا ہوا اپنے کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ فصیح صاحب برابر آکر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنے کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا - ہم نے جان بوجھ کر ان کے کھلاڑیوں کی کھنچائی شروع کر دی، بس صاحب آنکھیں نکل آئیں، بھنویں تن گئیں، کہا تو کچھ نہیں بس ہمارے پاس سے اٹھ کر چلے گئے- کتنی مرتبہ میں نے انہیں ناراض کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کہہ دیا مثلاً وہ جیسادی یعنی اطہر خان کی تعریف کر رہے ہیں - میں نے کہہ دیا: لو جی اب جغرافیہ والے لٹریچر میں بھی دخل دینے لگے - بس آنکھیں گھوم گئیں، چہرہ پر ایک رنگ آ رہا تو ایک رنگ جا رہا ہے، غصہ میں سٹاف روم سے باہر نکل گئے - شام کو میں ان کے گھر گیا، باہر نکلے، ناراض اور خفا تھے - میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا: «فصیح صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں، میں تو مذاق کر رہا تھا، آپ تو میرے بڑے بھائی ہیں، پھر آپ کے مقابلے میں میرا علم ہی کتنا ہے» - بس فصیح صاحب پگھل گئے: «ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آؤ یار میں اکیلا بور ہو رہا تھا» - پھر دنے کو جانے کے لیے آواز دینے - فصیح صاحب کی

ارتقائے نو

فلائٹ کیڈٹ سارجنٹ : **خالد اقبال**

نو آبادیات میں آقاؤں کے چہرے اجلے نظر آتے ہیں ۔ ان کی نشست و برخاست بہتر ہوتی ہے ۔ ان کے کھانے اعلیٰ اور ان کے لباس بہترین ہوتے ہیں ۔ جب آقا طاقت کا درہ لیے حکومت کرتا ہے تو مقامی لوگوں کے دلوں میں حسد کے جذبات اور دبی دبی نفرت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ آقاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتے ہیں ۔ جب انہیں آزادی مل جاتی ہے اور آقا اپنے ہنٹر سمیت رخصت ہو جاتا ہے تو نفرت کے جذبات وقت کے ساتھ اشک میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ہر کوئی سابقہ آقاؤں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں ہمارے ہاں اتنے انگریزی پڑھنے اور لکھنے والے نہ تھے جتنے ان کے جانے کے بعد پیدا ہوئے، یہاں تک کہ لوگ انگریزی طرز زندگی کو اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے ۔ جنھوں نے شیروانی پہن کر حصول آزادی کی جدوجہد کی تھی وہ سوٹ کے کے بغیر کسی محفل میں جانا اپنی ہتک سمجھنے لگے ۔ مشرقی پاکستان میں حالات مختلف تھے ۔ ۱۷۹۳ء کے مستقل بندوبست کے باعث ان کے براہ راست حاکم ہندو بن گئے تھے لہذا آزادی کے بعد ان پر بھی وہی رد عمل ہوا یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے نام بھی ہندو طرز پر رکھنے شروع کر دیے، لڑکیوں نے ماتھے پر تلک لگانا شروع کر دیا اور پھر یہی جذبہ مضبوط ہوتا چلا گیا اور نتیجہ ۱۹۷۱ء میں ظاہر ہوا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا ۔

جب حالات یہ ہو جائیں کہ آزادی حاصل کرنے والے اپنے مقرر کردہ نصب العین کی بجائے اپنے آقاؤں کی پیروی کرنا شروع کر دیں تو پھر انتظار کرنا چاہیے نئی نسل کا، اس نسل کا جس نے آقاؤں کے زمانے میں آنکھ نہ کھولی ہو ۔ جو آزاد سر زمین پر پیدا

خوانچے والے اور کباڑیئے نے اس کی شخصیت پر مضمون لکھے -

اس کے نام پر ادبی مجالس قائم ہوئیں -

خوانچے والے اور کباڑیئے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا -

انہیں ادب کے معمار تسلیم کر لیا گیا -

اور لوگوں کے اصرار پر وہ پبلشر بن گئے -

تاکہ وہ

ایسا ہی غیر فانی ادب شائع کرتے رہیں -